جلد ۷۶ ماہ صفر المظفر ۱۳۷۵ھ مطابق اکتوبر ۱۹۵۵ء عدد ۴

مضامین

شذرات

انگریزوں نے اپنے زمانہ میں اسلامی ہند کی جو تاریخیں لکھیں ان کو اپنے سیاسی مصالح کی بنا پر بہت مسخ کیا اور ہندو مسلمانوں میں منافرت پھیلانے کے لیے عموماً اس دور کے واقعات اور مسلمان حکمرانوں کی نہایت غلط تصویر پیش کی، اس کی تقلید بعض ناعاقبت اندیش ہندو مورخین نے بھی کی یہی تاریخیں اسکولوں اور کالجوں میں پڑھائی جاتی تھیں، اس لیے ان کا زہر تعلیم یافتہ طبقہ کے بڑے حصہ میں پھیل گیا، جس کے نتائج ہمارے سامنے ہیں، مگر ہندوستان کے عاقبت اندیش اور صاحب نظر بہی خواہوں نے جن میں ہندو مسلمان دونوں شامل تھے، اسی زمانہ میں اس فتنہ کو محسوس کر لیا تھا اور اس کے انسداد کی بھی کوشش کی، چنانچہ مسلمانوں کے علاوہ خود منصف مزاج ہندو مصنفین نے بھی اپنی کتابوں میں اسلامی دور کی بہت سی خوبیوں اور ہندوستان سے متعلق مسلمانوں کے سیاسی، علمی اور تمدنی خدمات کا بڑی کشادہ دلی سے اعتراف کیا،

مولانا شبلی مرحوم نے ۱۹۱۰ء میں دار العلوم ندوۃ العلماء میں تاریخی اغلاط کی تصحیح کا ایک خاص شعبہ قائم کیا جو کئی سال تک اس کام کو انجام دیتا رہا، مگر پھر اس کی باگ ایسے ہاتھوں میں چلی گئی، جو اسکو نہ چلا سکے، مگر مولانا مرحوم آخر عمر تک اپنے قلم کے ذریعہ ہندوستان کی اسلامی حکومتوں اور مسلمان حکمرانوں کے متعلق غلط بیانیوں اور غلط فہمیوں کی تصحیح و تردید اور ہندو مسلمانوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کی کوشش کرتے رہے، اور اس سلسلہ میں بڑے اہم مضامین لکھے، ان کے بعد حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ نے جنکو تاریخ ہند سے خاص ذوق تھا، ہمیشہ اس مقصد کو پیش نظر رکھا اور اس نقطۂ نظر سے تاریخ ہند کے مختلف پہلوؤں پر برابر مضامین لکھتے رہے، انکی مشہور کتاب "عرب و ہند کے تعلقات" بھی درحقیقت اسی سلسلہ کی کڑی ہے، اور اس کام کو زیادہ وسعت و تنظیم کے ساتھ انجام دینے کیلیے اسلامی دور کی

ایک مکمل اور صحیح تاریخ لکھنے کی تجویز پیش کی اور اسکا پورا خاکہ دسمبر ۱۹۳۲ء کے معارف میں شائع کیا جس میں تاریخ کی ترتیب کے علاوہ اسکی قدیم اہم اور نادر قلمی کتابوں کی نقل، مطبوعہ اور کمیاب کتابوں کا حصول، مغلیہ عہد سے متعلق قدیم یورپین سیاحوں کے بیانات اور ہندوستان کی تاریخ پر انگریزی میں جو قابل ذکر کتابیں لکھی گئی ہیں ان کی فراہمی، مرہٹوں اور سکھوں نے اپنے زمانہ میں اس کے متعلق جو تاریخی مواد پیدا کیا، اسکی جمع و ترتیب، ہندوستان کی تاریخ کے متعلق کتبخانوں میں جو نادر قلمی کتابیں ہیں، ان سے استفادہ وغیرہ بھی شامل تھا۔

اس تجویز کو اہل علم نے بہت پسند کیا، اور اس کے بارہ میں مفید مشورے دیے، جو معارف میں شائع ہو چکے ہیں، اور اس تجویز کے ساتھ اس کام کو دار المصنفین میں شروع بھی کر دیا اور اس سلسلہ میں تاریخ سندھ، مختصر تاریخ ہند، بزم تیموریہ اور بزم مملوکیہ وغیرہ مرتب ہو کر شائع ہوئیں، بعض کے مسودے موجود ہیں، جن کی اشاعت ابھی نہیں ہو سکی ہے، اور بعض زیر تالیف ہیں، لیکن اس کام کے لیے جس قدر سرمایہ اور جس سر و سامان کی ضرورت تھی وہ مہیا نہ ہو سکا، اس لیے پروگرام کے مطابق انجام نہ پا سکا،

ہندوستان کی آزادی کے بعد قومی نقطۂ نظر سے ایسی تاریخ کی اہمیت اور ضرورت اور بڑھ گئی ہے، اور تاریخ ہند کے سلسلہ میں بعض اور کام بھی کرنے کے ہیں، مثلاً اسکی اہم قلمی کتابوں کی تصحیح و اشاعت، جو پرانی مطبوعہ کتابیں نایاب ہو گئی ہیں انکی دوبارہ طباعت، الیٹ نے اپنی کتاب میں ہندوستان کی تاریخ کے عربی ماخذوں کو بھی نقل کر دیا ہے، مگر بعض کتابوں پر اسکی دسترس نہ ہو سکی تھی، جو اب چھپ گئی ہیں، ان میں ہندوستان کے متعلق جو معلومات ہیں، انکو جمع کرنے کی ضرورت ہے، اس سے اس دور کے متعلق بعض نئے معلومات سامنے آ جائیں گے اور بھی اس قسم کے متفرق کام ہیں، اگرچہ یہ سب کام تنہا دار المصنفین کے بس کے نہیں ہیں، اس کے لیے بڑے سرمایہ کی، دوسرے اہل علم کی مدد کی بھی ضرورت ہوگی جس کا بظاہر کوئی سامان نہیں ہے، تاہم جس حد تک دار المصنفین کے بس میں ہے وہ اس کو کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

اس سلسلہ میں ایک اور بات زبان قلم پر آ گئی، انگریزوں نے ہندو مسلمانوں میں منافرت کا جو بیج بویا وہ تو

انکے سیاسی مصالح کے مطابق تھا، مگر اب اسکی کیا ضرورت باقی رہ گئی ہے کہ بعض تنگ نظر اور متعصب مصنفین نے ابتک اسکا سلسلہ قائم رکھا ہے، بلکہ اور زیادہ بڑھ گیا ہے، انگریز تاریخ کے ذریعہ تو بہت زہر پھیلاتے تھے، مگر اپنی حکومت کے خاطر مسلمانوں کے مذہب پر حملہ نہیں کرتے تھے، اور اس زمانہ میں مذاہب کی توہین کی سزا بھی ہوتی تھی، اسلیے دوسرے لوگ بھی احتیاط کرتے تھے، وہ دفعہ تو اب بھی ہے، مگر مسلمانوں کے معاملہ میں بے اثر ہو گئی ہے، اسلیے اور بھی کھل کھیلنے کا موقع مل گیا ہے، اور نہ صرف مسلمان حکمرانوں بلکہ مذہب اسلام، اسکے پیغمبر اور اسکی مقدس کتاب کے متعلق نہایت غلط اور دل آزار باتیں تحریر کیجاتی ہیں اور نصاب کی بعض کتابوں تک میں بلاتکلف انکو لکھا جاتا ہے، جسکو مسلمان طلبہ بھی پڑھتے ہیں، چنانچہ حال ہی میں صوبہ بہار کی اسی قسم کی ایک کتاب پر اخبارات میں احتجاج ہو چکا ہے، تعجب ہے کہ نصاب کی کمیٹی ایسی لغو کتابوں کو نصاب میں شامل کرنے کی کیسے اجازت دیتی ہے، یہ طریقہ نہ صرف اخلاقی حیثیت سے نہایت نازیبا بلکہ حکومت کے مصالح کے بھی خلاف ہے، اگر حکومت ایک دو مصنفین کو سزا دیدے تو پھر کسی کو اسکی جرأت نہ ہو، مگر مسلمانوں کے معاملہ میں وہ کیوں ایسا کرنے لگی، اگر ہندو مذہب کے بارہ میں اس قسم کا جرم کسی مسلمان سے سرزد ہوتا تو پھر دیکھتے، اس کا انجام کیا ہوتا،

گذشتہ مہینہ انجمن ترقی اردو اتر پردیش کے وفد نے وزیر اعظم کے سامنے اردو کے بارہ میں جو شکایتیں پیش کی تھیں، انھوں نے انکے دور کرنے کا وعدہ کیا ہے، مگر اس قسم کے وعدے تو بارہا کیے جا چکے ہیں جن کے پورے ہونے کی نوبت کبھی نہیں آئی، اور پھر ہمارے وزیر اعظم جیسے اردو نواز کا وعدہ! اسلیے محض وعدوں کی کوئی قیمت نہیں، اگر اردو کے معاملہ میں حکومت کی نیت صاف ہو تو جسطرح وہ اپنے دوسرے احکام کی تعمیل کراتی ہے، اسیطرح اس نے اردو کو جو حقوق دیے ہیں اور انکے متعلق جو احکام و ہدایات صادر کرتی ہے اسکی تعمیل کی ذمہ داری بھی لے، ورنہ اس شکوہ و شکایت اور وعدہ وعید کا سلسلہ آخر کبتک جاری رہیگا، اردو پر تو ہر طرف سے یورش ہے اور انکی حالت "کھاؤں کدھر کی چوٹ بچاؤں کدھر کی چوٹ" کی ہو رہی ہے، اسکے حامی کس کس سمت کے حملہ سے اسے بچائینگے، یہ بھی عجب اندھیر ہے کہ ہندوستان کی ان چھوٹی چھوٹی زبانوں کو جنکی اردو کے مقابلہ میں کوئی حقیقت نہیں ہے، جو حقوق حاصل ہیں، اردو ان سے بھی محروم ہے، اسکے حامیوں میں وہ قوت نہیں کہ جنوبی ہند کی زبانوں کی طرح اردو کے حقوق بھی منوا سکیں، لے دیکر ایک محترم صدر جمہوریہ سے انصاف کی توقع تھی مگر انھوں نے اس معاملہ میں خموشی معنی دارد کہ در گفتن نمی آید کا حکیمانہ طریقہ اختیار کیا ہے، اور اتر پردیش کی حکومت اس پر معنی خاموشی کے مفہوم کی تفسیر اپنے رجحان کے مطابق کرتی ہے،

مقالات

سُلوکِ سُلیمانی پر ایک اجمالی نظر

از جناب محمد اشرف خان صاحب ایم اے، لکچرار عربی اسلامیہ کالج پشاور

(۲)

اسی طرح دینی دعوت و تبلیغ کی اہمیت و ضرورت اور اس میں انتہائی اہتمام و شغف کے باوجود حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک دعوت کی صحیح ترتیب کی صورت یہ تھی کہ پہلے اپنی اصلاح کی فکر کیجائے، اسکے بعد دوسروں کی، یہ نہ ہو کہ اپنی اصلاح سے غفلت تام ہو، اور دوسروں کی اصلاح کے غم میں گھلنا شروع کر دے، اس سے نہ دوسروں کو فائدہ پہنچتا ہے اور نہ اپنی اصلاح ہوتی ہے، جو خود مجسم تاریکی ہو، وہ دوسروں کو کیا روشن کر سکتا ہے، دلوں کی زندگی زندہ قلوب کی تاثیر سے میسر آتی ہے، مردہ دل کسی کی کیا مسیحائی کریں گے، الفاظ کی رنگینی، زبان کی روانی اور قلم کی جولانی سے دلوں کی ہدایت نہیں ہوتی، یہ نور خداوندی عطیۂ الٰہی اور زندہ دل بزرگوں کی صحبت سے میسر ہوتا ہے، قلبی ہدایت کے بغیر منبر اور سٹیج کی تقریروں یا کتب و رسائل کی تحریروں سے وقتی جوش و تاثر تو پیدا ہو سکتا ہے، علم میں بھی ایک گونہ اضافہ ہو سکتا ہے لیکن روح و قلب کی دنیا شاذ ہی ان سے بدلتی ہے، آرام باغ کراچی میں ایک جلسہ منعقد ہونے والا تھا، داعیٔ جلسہ نے حضرت شیخ سے درخواست کی کہ آپ تقریر فرمادیں، ہماری اصلاح ہو جائیگی، حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ نے انتہائی بلیغ انداز میں جواب دیا "اصلاح آرام باغ میں نہیں حجرہ میں

ہوتی ہے۔" سچ ہے۔

نہ کتابوں سے نہ کالج سے نہ زر سے پیدا
دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

ایک طالب نے لکھا "اصلاح خلق کا خیال چھایا ہے، اور اپنی طبیعت دیکھکر کڑھتی ہے، دل چاہتا ہے کہ اللہ اپنے دین کے پھیلاؤ کا ذریعہ اور سبب بنائیں" سیدی قدس سرہٗ نے جواباً لکھا "جی ہاں اس اصلاح خلق سے مقصود پس پردہ اپنی اصلاح ہونی چاہیے، ورنہ جو خود پاک نہیں، وہ دوسروں کو پاک نہیں بنا سکتا"

ایک مکتوب گرامی میں تحریر فرماتے ہیں:-

"دوسروں کے افادہ پر نظر رکھنے سے پہلے اگر اپنے استفادہ پر نظر رہے تو افادہ مؤثر بھی نہیں ہوتا، اپنے نفس کا حق دوسروں کے حقوق سے اہم واقدم ہے، ولنفسك عليك حقا۔ اس لیے پہلے اپنی بہی خواہی کیجئے، پھر دوسروں کی، استادی تک پہنچنے سے پہلے استاد بننے کی غلطی سے محفوظ رہیے، آپ جماعت[1] کے ساتھ کام تو کریں، مگر نظر اپنے اوپر ہو، اور اپنی درستی کی نیت ہو"

اسی طالب نے حضرت سیدی قدس سرہٗ کو لکھا کہ "اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اب طبیعت اپنے کو بھلا کر دوسروں کی فکر میں سرگرداں نہیں رہتی" جواباً ارقام فرمایا:

"بالفعل یہ کیفیت اچھی ہے، ایک وقت آئے گا، انشاءاللہ تعالیٰ جب فذکر ان نفعت الذکری کی تعمیل ہوگی، مگر فطری ترتیب یوں ہی ہے کہ اول خویش بعدہٗ درویش"

اس زمانے میں یہ مرض عام ہے کہ مسلمان عموماً اپنی اصلاح کی فکر سے بے نیاز ملت کی زبوں حالی اور تباہی کا رونا روتے ہیں، گو کچھ لوگوں کا جذبہ حسن نیت پر مبنی ہوتا ہے، مگر مرض کا ازالہ مرثیہ خوانی اور کفِ افسوس ملنے سے نہیں ہوتا، بلکہ اس کا صحیح علاج پہلے اپنی اس کے بعد دوسروں کی اصلاح ہے۔

محمد داؤد جان مرحوم سرحدی ایک صالح اور ملت کا درد رکھنے والے مسلمان تھے، انھوں نے

[1] مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی تبلیغی جماعت

حضرت سید الملۃ رحمہ اللہ تعالیٰ کو ملت کی زبوں حالی کی پراثر داستان لکھ بھیجی، اسکا جو جواب مرحمت فرمایا وہ ملت کی اصلاح کا درد رکھنے والے ہر سچے مسلمان کے لیے سرمۂ بصیرت ہے، پورا خط درج ذیل ہے:

انہ من سلیمان وانہ بسم اللہ الرحمن الرحیم

مکرم ومحترم۔ وفقکم اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ آپ کا عنایت نامہ ملا، آپکے مذہبی ولولوں کی بڑی قدر ہوئی، اللہ تعالیٰ آپ کو صراط مستقیم پر رکھ کر اپنی اصلاح اور تزکیہ کی بیش از بیش توفیق عطا فرمائیں۔

آپ کا کہنا سب سچ ہے، لیکن اصلاح کی تدبیر کیا ہے، وہ لوگوں پر یا مسلمانوں پر ماتم نہیں ہے، بلکہ سب سے پہلے خود اپنی حالت پر ماتم ہے، اور جب اپنی اصلاح سے فراغت ہو جائے، تو دوسروں کی فکر ہو، صرف دوسروں کی فکر صرف زبان سے کرنا اور اپنے سے غافل رہنا لیڈرانہ شان ہے، میری مخلصانہ خواہش ہے کہ ہم لوگ سب سے پہلے اپنے اپنے احوال پر نظر کریں، اپنی صحت روحانی واخلاقی ودینی کی فکر کریں، اسکے ساتھ اپنے اہل وعیال اور اپنے خاندان کی خبرگیری کریں، اور ان کی اصلاح کی فکر میں لگیں، انشاءاللہ اگر ہم اس طرف متوجہ ہوں گے تو سارے مسلمانوں کی حالت بدل جائے گی، اور اللہ تعالیٰ کی رحمت وبرکت کے ہم مستحق ہوں گے، کیا آپ اس نکتہ پر غور فرمائیں گے۔ والسلام سید سلیمان۔ ۲ مئی ۱۹۵۱ء"

اسی طرح ایک دوسرے طالب کو ارقام فرمایا:

"بے شبہ امت مرحومہ کی پریشان حالی اور پراگندگی کی کیفیت آپ کو متاثر کرتی ہوگی، مگر غور کیجئے کہ اس کا علاج آپکے ہاتھ میں ہے، جب آپ کی استطاعت سے وہ چیز خارج ہے تو اس کی فکر میں پڑ کر اپنا وقت آپ کیوں ضائع کرتے ہیں، یہ تو لیڈرانہ قسم کا ایک مرض ہے، آپ کو اختیار اپنے اوپر اور اپنے اہل وعیال اور متبعین کے اوپر ہے، آپ اپنی اور ان کی اصلاح کی فکر فرمائیں کہ آپ کی استطاعت میں ہے، آپ کی شدت احساس سے متاثر ہوا، خدا کرے کہ یہ احساس صحیح موقع پر صرف ہو۔"

اس کی مزید تشریح دوسرے مکتوب گرامی میں اس طرح فرمائی ہے:

"میرا مقصد یہ تھا کہ انسان کو پہلے اپنی پاکی کی کوشش چاہیے، اس کے بعد دوسرے کی فکر چاہیے، ایسا نہ ہو کہ موجودہ سیاسی لیڈروں کی طرح دوسروں کی فکر تو ہو، مگر خود اپنی فکر سے غفلت تام ہو، اس سے نہ اپنا ہی بھلا ہوتا ہے نہ دوسروں کا۔"

اسی قسم کی ایک اور تحریر کے جواب میں ارقام فرمایا:

"آپ کا خط پاکر بہت خوشی ہوئی کہ آپ کے دل میں دین کا درد ہے، جو اس زمانے کے مسلمان نوجوانوں میں کم ہے، آپ نے جو تجویز سوچی ہے، وہ سردست ناممکن العمل ہے، آپ ماشاء اللہ ابھی نوجوان ہیں، خیالات کی وسعت میں سیرکناں ہیں، بہتر یہ ہے کہ آپ دوسروں کو چھوڑ کر پہلے خود اپنی اصلاح کی فکر کریں، آپ ماشاء اللہ سعادتمند ہیں،

نشنو ای پند از حافظ کہ از جاں دوست تر دارند   جوانان سعادتمند پند پیر دانا را"

ایک اور طالب کو تحریر فرماتے ہیں:

"دوسروں کو اس خیر کی دعوت دینا جس پر گو آپ کا ابتک عمل نہ ہو، مگر نیت میں ہو، برا نہیں، کیا عجب آپکے لیے وہ محرک بن جائے، جو کہتے ہو کرتے نہیں کے یہ معنی نہیں کہ جو خود تم نہ کرو، وہ دوسرے سے نہ کہو، بلکہ یہ معنی ہیں کہ جو نہیں کرتے اس کا دعوی نہ کرو، غرض اس کا دعوی کرنا منع ہے، دعوت کرنا منع نہیں،"

حضرت والا کو ایک طالب نے تحریر کیا کہ "اللہ تعالیٰ مجھے دین کی خدمت اور عالم میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم والے طریقۂ زندگی کی ترویج کا ذریعہ بنائے"۔ حضرت سیدیؒ نے جواب میں تحریر فرمایا "دعا ہے کہ اللہ تعالےٰ آپ سے یہ کام لیں، اور آپ کو پہلے اپنا بنائیں اور پھر دین کی خدمت کا ذریعہ آپکو بنائیں اور بنائیں۔"

اس مختصر دعا میں صحیح دینی دعوت کا خلاصہ ہے کہ دعوت کی کامیابی کی پہلی شرط اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات کا قرب و تعلق ہے، جو اصلاح ظاہر و باطن کا حاصل اور طاعت الٰہی، اتباع نبوی اور ذکر

غالب کا ثمرہ ہے، وہ اللہ تعالیٰ ہی کا تعلق ہے جو داعیان حق کی ہر حالت میں دستگیری و رہنمائی کرتا ہے، اور عالم میں ہدایت کے ان چراغوں کی روشنی اسی تعلق سے عبارت ہوتی ہے، یہ تعلق جتنا قوی ہوگا اتنا ہی اللہ تعالیٰ کی ہدایت کا پرتو اس داعی کے ذریعے منعکس ہوکر دلوں اور روحوں کی ہدایت کے نور سے معمور کرتا رہے گا۔

تعلق مع اللہ کے ساتھ دین کی خدمت کا صحیح طریقہ بھی عنداللہ صحیح ہونا ضروری ہے، ورنہ انسان بعض اوقات اپنے زعم میں ایک کام دینی خدمت سمجھ کر کرتا ہے، لیکن حقیقت میں وہ دین کو نقصان پہنچا دیتا ہے، اس لیے دعوت کا علی منہاج النبوۃ ہونا ضروری ہے، ایک مرتبہ حضرت مولانا شاہ محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی تبلیغی جماعت کے دو مخلص خادم حاضر ہوئے، اور دعوت پر گفتگو شروع ہوئی، ہمارے سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا "مولانا الیاس تو مامور من اللہ تھے، ورنہ کہاں بنگلہ والی مسجد اور کہاں اللہ تعالیٰ کا حرم اور بدر کا میدان" (اشارہ تبلیغی کام کے ان مقامات تک پہنچنے کی طرف تھا) ان حضرات میں سے ایک صاحب (مخدومی محمد شفیع قریشی صاحب) نے عرض کیا، مولانا (الیاسؒ) فرماتے تھے کہ "یہ کام تو ہمیں نظر آرہا ہے کہ ہوکر رہے گا، لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اصولوں کے مطابق ہو"، فرمایا "جی ہاں، اصولوں کی پابندی ضروری ہے، پھر فقیر سے مخاطب ہوکر فرمایا کہ "مولانا الیاس کی سوانح کا مقدمہ جو میں نے لکھا ہے، آپ نے پڑھا ہے"، میں نے اثبات میں جواب دیا، فرمایا اس کی شرح لکھ سکتے ہو، مقدمہ گو مختصر ہے، لیکن قرآن و حدیث سے مطابقت دیکر اسکو بڑھایا جاسکتا ہے"، اس واقعہ کے نقل کرنے کا مقصد یہ ہے کہ حضرت والاؒ تبلیغی دعوت کا دینی اصولوں کے مطابق ہونا نہایت ضروری سمجھتے تھے، ورنہ وہ سراسر فتنہ بن سکتی ہے، ایک مرتبہ راقم سے فرمایا "لوگوں کو سختی سے دین کی طرف نہیں بلانا چاہیے، انبیاء علیہم السلام کی دعوت کا منشا شفقت تھی، لوگوں کو اپنی ہمدردی کا یقین دلائیے، پھر پیار سے دین کی طرف بلائیے،"

تو برائے وصل کردن آمدی نے برائے فصل کردن آمدی

ایک صاحب کو جنھوں نے اپنے متعلق جرأت حق کی کمی اور مداہنت کا اندیشہ ظاہر کیا تھا، ارقام فرمایا "جرأت حق نام حق کو خوبی اور نرمی کے ساتھ ظاہر کردینا ہے، سختی اور سخت کلامی کی ضرورت نہیں کہ وہ تو کام کو اور خراب کر دیتی ہے" ادعوالی سبیل ربك بالحكمة والموعظة الحسنة وجادلهم بالتی هی احسن۔ ایک دوسرے گرامی نامہ میں تحریر فرماتے ہیں "حق گوئی ہو، مگر اس طرح کہ کسی کی دل آزاری نہ ہو، اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف کوئی کام دیکھیں تو اس موقع پر حق گوئی مفید ہے، جب لوگ آپ کی بات سننے کو آمادہ ہوں، ورنہ قلب سے اس کو برا سمجھیں"

اس کا ہرگز یہ مفہوم نہیں کہ حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ اپنے متوسلین کو دعوت و تبلیغ سے منع فرماتے تھے، بلکہ حضرت کا یہ منشا تھا کہ دعوت سے پہلے اپنی اصلاح اور دعوت کا صحیح اصولوں کے مطابق ہونا ضروری ہے، ورنہ دعوت و تبلیغ کا جو جذبہ حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کے دل میں تھا، اسکی مثالیں کم ملیں گی، ایک مرتبہ نہایت درد سے فرمایا "آج سب دعوتیں موجود ہیں، لیکن دین کی دعوت جیسی ہونی چاہیے موجود نہیں، تمام نظام و مجلسیں دعوت کے زور سے قائم ہیں، سوشلزم ہو یا جمہوریت، لیگ ہو یا کانگریس ہر چیز دعوت سے قائم ہے، یہ اسلام کی کرامت ہے کہ اندر باہر سے اس قدر مار اور زد پڑنے کے باوجود کچھ لوگ اب بھی اسلام پر قائم ہیں، اخبارات ہوں یا ریڈیو، سینما ہوں کہ مخالفین کے پروپیگنڈے ہر چیز مخالف جا رہی ہے، اسلام کے نام پر اسلام کو زک پہنچائی جا رہی ہے، اسلام کو سب آواز دیتے ہیں مگر اسلام کی آواز پر کوئی نہیں جاتا"

ایک مرتبہ دین سے مسلمانوں کی غفلت اور دینی تعلیم و تبلیغ سے لاپروائی اور صاحب بصیرت و عزیمت علماء اور خادمان دین کی کمی کا تذکرہ کرتے ہوئے حسرت سے فرمایا:-

"جہاں ہزاروں کالج اور اسکول ہیں وہاں عربی کے مدارس کے ہیں، پھر ان کی مالی حالت

کیا ہے، جب اسکا رواج تھا، ہزاروں پڑھتے تھے اور امانت و دیانت کی بنا پر چپراسی کے کام کے نکلتے تھے اب ان مدارس میں جاتے ہی کتنے ہیں، تمام بڑے بڑے خاندان جن میں صلاحیت ہے، انگریزی پڑھ رہے ہیں، اور دینی تعلیم سے پوری غفلت برت رہے ہیں، عام طور سے لوگوں نے اپنی زندگی کا مقصد ہی منصب اور ملازمت بنا رکھا ہے، غیر اقوام میں مالدار خاندانوں کے لوگ اعلیٰ تعلیم پانے کے بعد مشنری کا کام شروع کر دیتے ہیں، اور اسے تبلیغ مسیحیت کا ذریعہ بناتے ہیں، کوئی مسلمان ڈاکٹر ہے جو ملت کی سرسبزی کے لیے اپنے کو صرف کر رہا ہے، ہمیں تو ایسے اشخاص کی ضرورت ہے کہ اعلیٰ تعلیم پانے کے باوجود دین کی خدمت کے لیے اپنے کو وقف کر سکیں"

ایک سفر کے دوران میں کچھ اٹالین مشنری ہم سفر ہو گئے، حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ ان سے رومن کیتھولک عقائد کے متعلق بات چیت کرتے رہے، بعد میں مجھ سے فرمایا "یہ مشنری روما سے پنجاب میں مسیحیت کی تبلیغ کرنے کے لیے آئے ہیں، اور پنجابی زبان سیکھی ہے، ہم میں سے کوئی ہے کہ اطالوی زبان سیکھی ہو اور وہاں اسلام کی دعوت دینے کے لیے گیا ہو"

حضرت والا قدس سرہ کے ایک خادم کو اللہ تعالیٰ نے تبلیغی جماعت کے ساتھ کچھ وقت تبلیغ و دعوت میں صرف کرنے اور پیدل سفر کرنے کی سعادت بخشی، حضرت کو معلوم ہوا تو گرامی نامہ میں تحریر فرمایا:

"مبارک ہو کہ آپ نے دین کی خدمت کے لیے اپنے پاؤں کو گرد آلود کیا"

ایک جا رہتے ہیں عاشق بدنام کہیں دن کہیں، رات کہیں، صبح کہیں، شام کہیں

دوسرے موقع پر فرمایا "جوان ہوتا تو میں بھی ان پیدل سفروں میں شریک ہوتا، پیدل کے دینی قافلوں کی مشابہت و نسبت صحابۂ کرام سے ہے" (او کما قال)

یہی صاحب جب ایک دوسری جماعت کو رخصت کرنے گئے، جو حج کے لیے پیدل جا رہی تھی،

اور خدمت اقدس میں دیر سے آنے کی وجہ اس جماعت کی مشایعت بیان کی تو ارشاد فرمایا "میرا ایک شعر ہے:

کچھ تو ہم رنگیٔ مستاں بھی ہے حاصل لیکن — جوششِ ولغزشِ رفتار کہاں سے لاؤں

اللہ تعالیٰ آپ کو اجر دے، جو قدم اللہ تبارک و تعالیٰ کے لیے اٹھائے جاتے ہیں، ان پر ثواب ہے، حدیث میں ثواب آیا ہے، ان کا ماخذ قرآن میں ہے۔ ماکان لاھل المدینۃ ... الی ..... ولا ینفقون نفقۃ صغیرۃ ولا کبیرۃ ولا یقطعون وادیا الا کتب لھم لیجزیھم اللہ احسن ما کانوا یعملون (التوبہ-۱۵) اور ومن یخرج من بیتہ مہاجرا الی اللہ ورسولہ ثم یدرکہ الموت فقد وقع اجرہ علی اللہ (نساء-۱۴)"

حضرت سید الملۃ کی تمام عمر دینی خدمت میں گذری، اس شہید علم و دین کے تبلیغی جذبہ کا ایک واقعہ نقل کیا جاتا ہے۔

حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ بیمار تھے، تنفس کا شدید عارضہ تھا، ڈاکٹروں نے چلنے پھرنے کی ممانعت کر رکھی تھی، اسی دوران میں تبلیغی حضرات کا ایک اجتماع لائلپور میں منعقد ہونے والا تھا، حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کی خدمت میں تبلیغی حضرات نے راقم کے ذریعے اجتماع میں شرکت کی درخواست کی، فرمایا، آپ کو معلوم ہے، میں تو بیمار ہوں، اس بنا پر انھیں میری معذوری کی اطلاع کر دیجئے، لیکن کچھ دیر بعد خود ہی برادرم سلمان سلمہ کو فرمایا کہ میرے سفر کا سامان درست کر دو، اور راقم سے مخاطب ہو کر فرمایا "وہ اپنے لیے تھوڑا ہی بلا رہے ہیں، اللہ تعالیٰ کے دین کی دعوت ہے، اس لیے انکار نہیں کر سکتا، اور اسی بیماری اور ضعف کی حالت میں اسلام کا یہ جوانمرد سپاہی دین کی خدمت کے لیے آمادۂ سفر ہو گیا، رحمہ اللہ تعالیٰ کے اس سفر کے دوران میں تبلیغی جماعتوں کو رخصت کرتے وقت آنکھیں اشکبار تھیں اور زبان مبارک پر یہ الفاظ تھے۔

"اے اللہ جس طرح تو نے اس امت کے پہلے حصہ سے (دین کی خدمت کا) کام لیا، اس پچھلے حصہ سے بھی کام لے لے، اور ہمیں ضائع نہ فرما۔"

کراچی سے ایک تبلیغی جماعت تبلیغ و حج کا فریضہ ادا کرنے کے لیے پیدل روانہ ہوئی حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کے ان "غرباء" کے قافلہ کو بڑی رقت آمیز دعا کے ساتھ رخصت فرمایا اور بعد میں ان کے امیر جماعت کو یہ خط لکھا:

کراچی - ۵

۱۴ جنوری ۱۹۵۲ء

بخدمت مکرمی جناب میانجی عادل صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ آپ لوگوں کے حالات معلوم ہوتے رہتے ہیں، دل سے دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کے رفقاء کو اتباع مرضیات کی توفیق عنایت فرماویں، اور بخیریت منزل مقصود تک پہنچائیں، آپ لوگ اس وقت بفضلہ تعالیٰ ایک بڑے مقصد کے لیے سفر کر رہے ہیں، اس راہ کا توشہ اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اور باہم ایک دوسرے کے ساتھ حسن سلوک اور مسلمانوں پر شفقت ہے، آپ لوگ اس وقت اسلام کے پیغامبر اور قاصد اور اللہ تعالیٰ کے داعی ہو کر نکلے ہیں، سلامتی اور محبت کا یہ پیغام مسلمانوں میں پھیلاتے ہوئے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام سے مسلمانوں کا دل بڑھاتے اپنے راستہ کو طے کریں، ذکر و شکر الٰہی ہر وقت جاری رہے، میری اور سب کی طرف سے سب کو سلام مسنون پہنچائیں۔ والسلام

سید سلیمان ندوی

حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی تبلیغی جماعت میں اپنے متوسلین کی شرکت مستحسن سمجھتے تھے، ایک مرتبہ ایک طالب علم نے لکھا "الحمد للہ تبلیغی جماعت میں کچھ کچھ وقت گذرتا

اس کے جواب میں ارقام فرمایا "نیک لوگوں کی صحبت بہت مفید ہے"۔ ایک دوسرے طالب نے لکھا کہ "نیک لوگوں کی صحبت اختیار کرنے اور اپنی اصلاح کی نیت سے مولانا الیاسؒ کاندھلوی کی مبلغین کی جماعتوں کے ساتھ جاتا ہوں"۔ جواب میں تحریر فرمایا کہ "اس صحبت کو جاری رکھیے"۔ ایک دوسرے خط میں ان ہی کو ارقام فرمایا "آپ جماعت کے ساتھ کام تو کریں، مگر نظر اپنے اوپر ہو اور اپنی درستی کی نیت ہو"۔

ان مباحث سے "سلوک سلیمانی" کی جامعیت اور ہمہ گیری کا ایک حد تک اندازہ ہوگیا ہوگا۔

اب خاص فن کے متعلق حضرت شیخ رحمہ اللہ تعالیٰ کی تعلیمات کا مختصر خاکہ پیش کیا جاتا ہے،

ضرورت شیخ اس طریق میں شیخ کی اہمیت و ضرورت محتاج تعارف نہیں، کہ بغیر شیخ کامل کی رہنمائی و دستگیری اور اس کی محبت و اطاعت کے اس راستے میں ایک قدم بھی اٹھانا دشوار ہے۔

جو موسیٰ بھی ہوں تو اتباعِ خضر لازم ہو	ہدایت منحصر ہے اتباعِ شیخ کامل میں

شیخ ہی وہ ذریعہ ہے، جس کے واسطے سے اللہ تعالیٰ اپنے گوناگوں فیضان و برکات سے طالب کو نوازتے ہیں،

یہ کس میکدہ سے اٹھی موج مے	چلی آرہی ہے جو فیضان ہو کر

فیض ہے یہ کس ولیِ وقت کا	اب جو میرا شعر ہے الہام ہو

اس کی صحبت "اکسیر اعظم اور کبریت احمر ہوتی ہے، یہ فیض صحبت ہی تھا جس نے صحابہ کی زندگی کے رخ کو یکسر بدل دیا اور ان کو اسوۂ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا مکمل نمونہ بنادیا، اور ان سے آیندہ ہدایت کا سلسلہ جاری ہوا، یہ الٰہی سلسلہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی طرح دائمی ہے، ہمارے حضرت والا فرماتے تھے "قرن اول میں جماعت سے جماعت متاثر ہوتی تھی، پھر جب اسلامی معاشرہ میں اضمحلال آیا تو جماعت کے بجائے افراد کاملین پیدا ہونے لگے، اور افراد سے افراد متاثر ہونے لگے ...... دنیا ابھی خالی نہیں ہوئی ہے ہمارے آپ کے دل خالی ہو جائیں، لیکن ابھی اللہ تعالیٰ کے بندے موجود ہیں، جیسے چراغ کو چراغ جلاتا ہے، اسی طرح جن کے دل میلے ہو چکے ہیں، پھر ان کو روشن قلوب سے ملا دو وہ صاف

اور روشن ہو جائیں گے۔ قرآن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سراجاً منیراً (روشن چراغ) کہا گیا ہے، اب تک جو صلحا موجود ہیں، ان کے دل اسی چراغ (سراجاً منیرا) سے روشن ہوئے ہیں، شجرہ میں ان چراغ جلے ہوؤں کے نام لکھے ہیں، جیسے محدثین اپنی سندیں ملاتے ہیں، اسی طرح یہ چراغ جلے ہوئے اپنا سلسلہ شجرہ میں ملاتے ہیں"۔ ایک مرتبہ ارشاد فرمایا "زمین و آسمان کی روشنی تو اللہ تعالیٰ ہی ہے، اللہ نور السمٰوٰت والارض اللہ تبارک و تعالیٰ کو چھوڑ دیا جائے تو نور کہاں رہ جاتا ہے، ظلمت ہی ظلمت رہ جاتی ہے، نور تو اللہ تعالیٰ ہے، یہ چیز پروپیگنڈے سے ہاتھ نہیں آتی، زندہ دل بزرگوں کی صحبت اختیار کیجئے، جیسے دیے سے دیا روشن ہوتا جاتا ہے، صحبت سے دل روشن ہو جاتے ہیں"۔

انسان فطرۃً دوسرے کی صحبت سے متاثر ہوتا ہے، خصوصاً اہل اللہ کی صحبت تو سراپا شعلۂ طور ہے، جو ماسوا کے تعلقات کو جلا کر خاکستر کر دیتی ہے، یہ حکمت الٰہی اور عادت خداوندی ہے، کہ اپنے نور ہدایت و فیضان کو شیخ کے ذریعہ طالبین کے دلوں میں منتقل کر دیتا ہے، اور دلوں کی کھیتی شیخ کی آبیاری سے ہری ہوتی ہے۔

تیرے اک چھینٹے سے اے ابر بہاری ان دنوں	سبز ہے شاداب ہے سیراب ہے گلزار دل

صحبت کے اثر سے زندگی خود بخود بدل جاتی ہے اور اہل دل کی کیمیا اثر نگاہ مس خام کو زر خالص بنا دیتی ہے۔ حضرت شیخ رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں

تری نظر میں ہے تاثیر مستیِ صہبا	تری نگاہ جسے چاہے بادہ خوار کرے

تری نگاہ میں دونوں خواص رکھے ہیں	وہ چاہے مست کرے چاہے ہوشیار کرے

اس راہ میں ہر وقت کی دھن اور دھیان سے ہی کام چلتا ہے، بغیر فکر باطن کے رسوخ حاصل نہیں ہوتا، جو صحبت کا ثمرہ اور شیخ کا فیض ہوتی ہے، یہ قلبی فکر و تقاضا، دھن اور دھیان، سوز و طلب ہی حصولِ مدعا کا ذریعہ ہے، اس لیے ایک نعمت ہے۔

تراوش سے خونِ جگر کی نہ ڈر کہ مرہم سراپا یہ ناسور ہے

اور عشق کی بے تابیاں اور مجبوریاں بھی قرب و وصل سے کم نہیں،

یہ عالم ہے دل کا غمِ عشق میں کہ مغموم ہو کر بھی مسرور ہے

غرض خاصانِ خدا کی صحبت محبت الٰہی کا سرچشمہ ہے، جن قلوب کو کتابوں کے سیاہ نقوش اور بے عمل ادعائے علم کی سیاہی سے زنگ آلود کر دیتے ہیں، صحبت کا نور انھیں یکسر چمکا دیتا ہے، ایک ڈاکٹر اور شہرۂ آفاق مصنف سے جنھوں نے استنبول میں ایک پرانی کتاب کے ملنے کی خبر دی تھی، احقر کی موجودگی میں ارشاد فرمایا "ڈاکٹر صاحب کتنی کتابیں پڑھیے گا"۔ حضرت شیخ کا مقصود یہ تھا کہ

صد کتاب و صد ورق در نار کن جان و دل را جانبِ دلدار کن

اسی مضمون کا حضرت شیخ کا ایک شعر ہے

مرے ہوش و خرد نے جمع جو خرمن کیا برسوں لگا دے برقِ ایمن! آگ تو اس میرے حاصل میں

ایک مرتبہ حضرت شیخ رحمہ اللہ تعالیٰ کسی اخبار کا مطالعہ فرما رہے تھے، راقم قلبِ اقدس کی طرف متوجہ تھا، کہ ناگاہ دل میں یہ خطرہ گذرا، کاش حضرت کچھ ارشاد فرماتے، اس خطرہ کے گذرتے ہی مسکرا کر فرمایا "لوگ کہتے ہیں کچھ کہیے، اور اکبر کہتے ہیں۔ ع

"تاثیر دکھا تقریر نہ کر"

حضرت شیخ قدس سرہٗ کے ہاں گو معروف توجہ کا دستور و اہتمام نہ تھا لیکن صحبت کی تاثیر کے ضمن میں ایک واقعہ بیان کیے بغیر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا، حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں میری آخری حاضری ۲ر جولائی ۱۹۵۳ء سے ۱ر اگست ۱۹۵۳ء تک رہی، میرا قیام دوسری جگہ تھا، مگر روزانہ حاضری ہوتی تھی، حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ کی طبیعت عموماً علیل و کمزور رہتی تھی، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حضرت کو وقت موعود کے قریب آنے کا گمان غالب ہو چلا تھا، اور اشارے تصریح کی حد تک واضح تھے،

چنانچہ بارہا ارشاد فرمایا کہ "اپنے آخری ایام میں شبلی مرحوم کہا کرتے تھے ع

چراغ کشتۂ محفل سے اٹھے گا دھواں کب تک"

جس سے حضرت والا کی اپنی ذات مراد ہوتی تھی، ایک مرتبہ ایک حکیم صاحب نے نبض دیکھ کر کہا "نبض تیرہ بار چل کر ٹھہر جاتی ہے" فرمایا "اتنی عمر چلتی رہی ہے آخر آرام بھی کرے گی"، بہر حال حضرت سیدی قدس سرہٗ کو گویا یقین تھا کہ یہ اس بدنصیب کی آخری حاضری ہے، اس لیے لطف و کرم کا دریا جوش پر تھا، راقم نے عرض بھی کیا تھا

دیر سے آیا ہوں ساقی دور سے آیا ہوں میں ہو عطائے خاص مجھکو جو عطائے عام ہے

اشرف فقیر است و گدا افتادہ در شہر شما شاید کہ از بہر خدا سوئے غریباں بنگری

میری واپسی کے قریب پوچھا "کب روانگی ہے"، جب دو دن رہ گئے تو ایک دن تنہائی میں اس فقیر کے حال پر توجہ فرمائی، تھم تھم کر ملفوظات سے سرفراز فرماتے رہے، اس دوران میں راقم کو توجہ باطنی کا ایسا شدید احساس ہوا کہ معلوم ہوتا تھا کہ قلب بیٹھ جائے گا، اس تاثیر کی یاد آج تک تازہ ہے،

خدا جانے مجھے کیا دے کے ساقی نے پلایا ہے وہ کب کا جا چکا پھر بھی نظر آتا ہے محفل میں،

یہ کس میکدہ سے اٹھی موج مے چلی آرہی ہے جو فیضان ہو کر

حیات نو مجھے ان کی نگاہ ناز نے بخشی بھرا ہے آبِ حیواں کاسۂ زہر ہلاہل میں

حضرت سیدی قدس سرہٗ اپنے شیخ حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی محبت میں سرشار تھے، اور بڑی عظمت و عقیدت سے ان کا تذکرہ کرتے تھے، ان کے فنا فی الشیخ ہونے کی کیفیت ان کے اشعار و اقوال سے ظاہر ہے، فرماتے تھے "میری شاعری حضرتؒ کے تعلق کے ساتھ شروع ہوئی اور حضرت کے وصال پر ختم ہو گئی"، یہ اشعار رسمی شاعری نہیں بلکہ عشق و محبت کا بادۂ سر جوش ہیں، ان سب کو نقل کرنا اگرچہ طوالت ہے، لیکن امید ہے کہ ناظرین بھی اس سے لطف اندوز ہوں گے،

اس لیے کچھ منتخب اشعار نقل کیے جاتے ہیں،

مجھ پہ جادو یہ چلایا کس نے   مجھکو دیوانہ بنایا کس نے

میں تھا آسودۂ خوابِ غفلت   مجھکو سوتے سے جگایا کس نے

اپنا ہر داغ نظر میں آیا   ایسا آئینہ دکھایا کس نے

عشق کی راہ یقیں کی منزل   مجھکو یہ راز بتایا کس نے

کھو گئی عقل و خرد کی دنیا   جام سرشار پلایا کس نے

اب کچھ آباد ہے دل کی بستی   اس خرابہ کو بسایا کس نے

دل تھا مردہ لحدِ سینہ میں   اس کو قُم کہہ کے جلایا کس نے

جس کو تھا آٹھ پہر کا رونا   ایسے روتے کو ہنسایا کس نے

یہ کس میکدہ سے اٹھی موج مے   چلی آرہی ہے جو فیضان ہو کر

قیل و قالِ مدرسہ کو چھوڑ کر   شیخ بھی رندوں میں اب شامل ہوا

آج ہی پایا مزہ ایمان کا   جیسے قرآں آج ہی نازل ہوا

ایسے کچھ انداز سے تقریر کی   پھر نہ پیدا شبہۂ باطل ہوا

گھول کر کیا جانیے کیا دیدیا   حلق سے اترا کہ شیدا دل ہوا

دیکھ کر سب کو اسی کو چن لیا   جو نگاہِ ناز کے قابل ہوا

قید پا ہے حلقۂ پیرِ مغاں   پھر نہ اٹھا جو یہاں داخل ہوا

اگر ساقی تری چشمِ فسونگر کام کر جائے   بدل جائے نظامِ دل بدل جائے جہانِ دل

تری ساقی کرامت اس سے بڑھکر اور کیا ہوگی   زباں میری لگی اک گھونٹ میں کرنے بیانِ دل

آواز دے کے کوئی ادھر سے ابھی گیا   ہر سو تلاشِ نقشِ قدم کر رہا ہوں میں

کس نے بھر دی یہ صدائے دلنواز   ہر رگِ جاں سازِ الا اللہ ہے

ذرہ ذرہ عالمِ محسوس کا خاموش ہو   یار ہے گرمِ سخن محفل سراپا گوش ہے

حبذا پیرِ مغاں دریادل و دریا نوال   جمع ہیں میخوار میخانے میں نوشا نوش ہے

اے مسیحِ دردِ دل، چارہ گرِ آزارِ دل   پا رہا ہے تیرے درماں سے شفا بیمارِ دل

دور ہوتی جا رہی ہے ہر کھٹک جو دل میں تھی   تیرے سوزن سے نکلتے جا رہے ہیں خارِ دل

اے ساقیِ مدہوش کردے مجھے بیہوش   کیسے ہو نشہ پیدا اب بادۂ پرجوش

یاد آیا چشمِ ساقی کا کرم   پھر چھلکتے جام کی امید ہے

دید اس کی مایۂ عیش و نشاط   ابروے ساقی ہلالِ عید ہے

اس سے پایا دے ملت نے فروغ   ختم اس پر دورۂ تجدید ہے

ادھر کہتا گیا وہ اور ادھر آتا گیا دل میں   اثر یہ ہو نہیں سکتا کبھی دعوائے باطل میں

حیاتِ نو مجھے ان کی نگاہِ ناز نے بخشی   بھرا ہے آبِ حیواں کاسۂ زہر ہلاہل میں

جو موسیٰ بھی ہوں تو اتباعِ خضر لازم ہے   ہدایت منحصر ہے اتباعِ شیخ کامل میں

سازگار اب گردشِ ایام ہے   دور میں ہشتاد سالہ جام ہے

اس کی دزدیدہ نگاہی کے نثار   آج ہی آغاز کا انجام ہے

اب درِ پیرِ مغاں چھوٹے نہیں   اس کی مٹی میں بھی کیفِ جام ہے

فیض ہے یہ کس ولیِ وقت کا   اب مرا جو شعر ہے الہام ہے

آتا ہے خدا ابھی ترے صدقے میں مجھے یاد   گویا کہ بظاہر میں خدا بھول گیا ہوں

ہر سمت نظر آتے ہیں ہر وقت وہ مجھکو   دوریِ مسافت کا گلا بھول گیا ہوں

سجدہ طرفِ کعبہ ہے دل تیری طرف ہو   اب قبلہ بھی اے قبلہ نما بھول گیا ہوں

اے خضر مرا قافلہ کس سمت چلا ہے ـــــ تمیز صدا ہائے درا بھول گیا ہوں
دور سے آیا ہوں ساقی دیر سے آیا ہوں میں ـــــ ہو عطائے خاص مجھکو جو عطائے عام ہو

بادۂ عرفان کے اس دور کو ایک قطعہ پر ختم کرتا ہوں،

اے خوشا جوشِ محبت لے خوشا تاثیر عشق ـــــ گاہے گاہے ان کو میری یاد اب آنے لگی
نامۂ عرضِ محبت شوق سے پڑھنے لگے ـــــ خط سے کیا دل کے دھڑکنے کی صدا آنے لگی
میری وارستہ طبیعت مدح کے قابل ہوئی ـــــ اب مرے جوشِ جنوں کی بھی ادا بھانے لگی
جب اے دل اپنے عیبوں پر نظر اپنی پڑی ـــــ اپنے دعوائے ہنر سے شرم سی آنے لگی

شیخ کی محبت کے سلسلہ میں بعض واقعات قابل ذکر ہیں،

ایک مرتبہ مختلف موضوعات اور سیاست پر گفتگو کے بعد مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا "بزرگوں کی مجالس میں ان چیزوں کا نام تک نہ تھا، گویا اس زمانے میں وہ تھے ہی نہیں"۔

ایک مجلس میں مہاجرین کے مال و جائداد کے بھارت میں رہ جانے کا ذکر تھا، فرمایا "اللہ میاں آجکل زبردستی صوفی بنا رہے ہیں، صوفیہ اسباب کی کثرت سے مشوش ہوتے تھے، ہمارے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ ہر سال اپنے سامان کا جائزہ لیتے تھے، اور گرمی اور سردی کے دو دو جوڑوں کے سوا سب اللہ تعالیٰ کے راستے میں دیدیتے تھے"۔

ایک صاحب کے استفسار پر تحریر فرمایا "یہ خاکسار صرف لفظاً پیر ہے، اللہ تعالیٰ معنیً بھی بنا دیں، آپ نے ڈان میں جو پڑھا ہے وہ صحیح ہے کہ مجھے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ سے تعلقِ خدمت ہے، اللہ ان کی تعلیمات کی برکت سے بہرہ مند فرمائیں"۔

شیخ کی اتنی محبت و عقیدت کے باوجود حضرت والا رحمہ اللہ تعالیٰ ایک محقق صوفی کی حیثیت سے

شیخ کو محض ایک آلہ اور ذریعہ اور اللہ تبارک و تعالیٰ کو معطی حقیقی سمجھتے تھے کہ شیخ کی حیثیت حدیث انا قاسم واللّٰہ معطی کے مطابق اسی قدر ہے، اور ہمیشہ تلقین فرماتے تھے کہ نظر صرف اللہ تعالیٰ پر ہونی چاہیے، ایک طالب کی اس تحریر کا کہ "ہر وقت نظر کرم کا طالب ہوں"۔ ان الفاظ میں جواب دیا:

"نظر ہر وقت اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم پر چاہیے، انسان کے بس میں کیا ہے، جو کسی انسان کو دے سکے"

اسی قسم کی ایک دوسری تحریر پر ارقام فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے خود دیتے ہیں، شیخ صرف واسطہ ہوتا ہے، جیسے سیرابی پانی سے ہوتی ہے مگر پانی کسی ظرف سے پیا جاتا ہے، تو ظرف کو بجز واسطہ کے کوئی دخل نہیں، معطی اللہ تعالیٰ ہیں"۔

ایک طالب نے اپنے عریضہ میں حضرت والا رحمۃ اللہ تعالیٰ کے فیض و احسانات کا تذکرہ کیا، اس کے جواب میں تحریر فرمایا:

"میری نسبت آپ جو کچھ تحریر کرتے ہیں وہ صرف آپ کا حسن ہے، باقی ہیچ ہے، ممکن ہے آپکی طلب کے وسیلہ سے اللہ تعالیٰ مجھے واسطۂ محض بنا کر آپ کو بیش از بیش عطا فرمائیں"۔

ایک طالب نے لکھا کہ "سننے میں آیا ہے کہ کئی بار اللہ کے بندوں نے اپنی دعا و ہمت سے ناکاروں کو کام کا بنا دیا، اگر یہ حقیقت ہے تو یہ نابکار نگاہ کرم کا سب سے زیادہ محتاج ہے"۔ جواب میں ارقام فرمایا "بھائی یہ اللہ تعالیٰ کی عنایت و رحمت خصوصی ہے، جو اپنی شفقت سے کسی پر کرتے ہیں، ورنہ سنت اللہ جو جاری ہے ہم کو اس کے راستے ان تک پہنچنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

ملنے نہ ملنے کا تو وہ مختار آپ ہو ـــــ پر تجھکو چاہیے کہ تگ و دو لگی رہے"۔

حضرت والا تکلف کے ساتھ تصور شیخ کو منع فرماتے تھے، اور اگر خود بخود آجائے تو اسے برا نہیں سمجھتے تھے، ایک طالب کو لکھتے ہیں "میرا تصور بغیر تکلف کے آجائے تو کوئی حرج نہیں کہ یہ بہ تقاضائے محبت ہے، مگر تکلف کے ساتھ تصور میں لانے کی کوشش نہ کریں"۔ ایک دوسرے طالب کو جن پر حضرت شیخ کا دھیان مستولی ہو گیا تھا، تحریر فرمایا، "یہ صرف آپ کی محبت کا کرشمہ ہے"

اپنے اختیار و ارادہ سے تصور جمانا غلط ہے، اگر از خود ہو جائے تو کوئی حرج نہیں، یہ ایک حال ہے جسکا ذکر میرے ایک شعر میں بھی ہے:

سجدہ طرف کعبہ ہے دل تیری طرف ہے ۔۔۔ اب قبلہ بھی اے قبلہ نما بھول گیا ہوں"

حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک شیخ کے حقوق کی ادائیگی کے معنی یہ تھے کہ اسکی جو ہدایات شرع کے مطابق ہوں انکو بجالایا جائے، ایک گرامی نامے میں ارقام فرماتے ہیں،

"اس کے (یعنی شیخ کے) حقوق کی ادائیگی یہی ہے کہ اس کے ہدایات کو جو تحت شرع ہوں، بجالانے کی کوشش میں لگا رہے"۔

بیعت حضرت سیدی قدس سرہ بیعت کے رسمی طریقہ کو ضروری نہیں سمجھتے تھے کہ سلوک میں اصل مقصود تربیت ہے، بیعت صرف اس کا ایک ظاہری نشان ہے، مقصد کے حصول میں اسے کوئی اہمیت حاصل نہیں، شیخ اگر بیعت کو مناسب سمجھے اور وہ استحسان کے درجے میں ہو تو بہتر ہے، ورنہ اگر شیخ تربیت میں اور سالک اس کی تعلیمات کی پیروی میں کوتاہی نہ کرے، تو بغیر بیعت کے بھی فیض حاصل ہو سکتا ہے، اور عدم بیعت سے کوئی نقصان نہ ہوگا، مولانا مسعود عالم ندویؒ کو تحریر فرماتے ہیں، "بیعت کا رسمی طریقہ غیر ضروری ہے، یہ میں نہیں کہتا، بلکہ ہمارے بزرگوں کا ارشاد ہے"۔

راقم سے ایک مرتبہ فرمایا "مقصود تو تعلیم ہے، لوگوں میں بیعت کی جتنی اہمیت ہے، تعلیم کی اتنی نہیں" ایک گرامی نامے میں تحریر فرمایا "بیعت ضروری شے نہیں، تاہم اگر انکو اصرار ہو تو خط کے ذریعے ہو سکتی ہے"۔

درحقیقت بیعت شیخ و مرید کے درمیان ایک معاہدہ ہوتا ہے کہ شیخ اسکی اصلاح دین و خیر خواہی میں کمی نہ کریگا اور مرید شیخ کی جو ہدایات شریعت کے خلاف نہونگی، ان کی پوری پابندی کرے گا، اس معاہدہ یا بیعت سے پیشتر صحبت یا خط و کتابت کے ذریعے دونوں میں مناسبت پیدا ہونا ضروری ہے کہ نفع کا مدار مناسبت پر ہے، اس لیے جبتک یہ مناسبت پیدا نہ ہو، شیخ کی ہدایات پر عمل کرتا رہے، اور بیعت میں

عجلت نہ کرے، یہ شیخ کی صوابدید پر ہے کہ جب مناسب سمجھے بیعت کرلے، حضرت شیخ قدس اللہ اسرارہٗ ایک طالب کو اسی کی تلقین کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"بیعت شیخ و مرید کے باہمی معاہدہ کا نام ہے، وہ بھی ان شاء اللہ تعالیٰ اپنے وقت پر ہوگا، یہ سب اسی کے لیے تیاری ہے"۔

دوسرے گرامی نامے میں اسی کو تحریر فرماتے ہیں:

"آپ اپنے معمولات میں مصروف رہیں، پھر بیعت کی خواہش کریں، چنانچہ جب آپ کو اپنے معمولات کی طرف سے اطمینان ہو جائے تو ایک خط میں یہ خواہش ظاہر کریں کہ میں آپکے ہاتھ پر بیعت ہونا چاہتا ہوں، تو پھر میں بیعت ان شاء اللہ تعالیٰ لے لونگا"۔

بیعت کے لیے مناسبت شیخ سے محبت اور اپنی اصلاح کی عزیمت ضروری ہے، حضرت اقدسؒ ارقام فرماتے ہیں:

"بیعت کے لیے صرف یہ شرط ہے کہ اپنی اصلاح کی عزیمت دل میں پیدا ہو، اور جس سے تعلق رکھتا ہو، اس کی محبت ہو"

جب یہ شرائط پوری ہو جائیں تو بیعت غائبانہ خط کے ذریعے بھی ہو سکتی ہے، حضرت والاؒ تحریر فرماتے ہیں:

"بیعت کے لیے حاضری چنداں ضروری نہیں، غائبانہ بھی ہو سکتی ہے"۔

دوسرے گرامی نامے میں ہے "بیعت خط سے بھی ہو سکتی ہے"،

ایک طالب کو لکھتے ہیں "بیعت ضروری شے نہیں، تاہم اگر ان کو اصرار ہو تو خط کے ذریعے ہو سکتی ہے"۔

حضرت والا اعزّہ بار کی بیعت میں زیادہ تاخیر نہیں فرماتے تھے، اور انکی طلب پر جلد ہی بیعت سے سرفراز فرمادیتے تھے، اسی طرح شادی شدہ عورتوں کو ان کے خاوند کی اجازت کے بعد جلد بیعت فرمالیتے تھے، لیکن ناکتخدا لڑکیوں کی تربیت بغیر بیعت کے فرماتے تھے، ایک مرتبہ راقم سے فرمایا "عورتوں کی بیعت میں ایک مشکل ہے، نہ معلوم آگے چل کر ان کی شادی کس سے ہو، وہ پسند کرے یا نہ کرے، شادی شدہ عورتوں کے خط پر خاوند کے اور لڑکیوں کے خط پر باپ یا بھائی کے دستخط ضروری سمجھتے تھے، ایک طالبہ کو لکھتے ہیں:

"آپ کے خط پانے سے خوشی ہوئی، آپ کو چاہیے کہ اپنے اس خط پر اپنے بھائی صاحب کے دستخط کرا لیتیں، یا اپنا تعارف کرا لیتیں، گو زبانی...... آپ کا حال معلوم ہو گیا، دوسرے یہ کہ آپ اپنا نام نہ لکھیں، اسکی جگہ ہمشیرہ فلاں لکھ دیا کریں"۔

لیکن تعلیم یافتہ طبقہ اور امراء کی بیعت میں بہت احتیاط فرماتے تھے، اور جب تک ان سے پوری طرح مناسبت اور ان کی اصلاح کا ظن غالب نہ ہو جاتا تھا بیعت نہیں لیتے تھے، راولپنڈی کے ایک سفر میں حضرت والا بیمار تھے، کچھ دنوں تک کرنل سرور کے زیر علاج رہے، قیام ڈی، ام ملک اور محمد شفیع قریشی کی کوٹھی میں تھا، دوران قیام میں ایک میجر (ڈاکٹر) صاحب نے میرے سامنے بیعت پر انتہائی اصرار کیا، حضرت والا نے پہلے ان سے قصد السبیل کے خاص خاص مقامات پڑھوائے پھر بیعت کی ذمہ داریاں سمجھائیں، لیکن وہ بیعت ہی پر مصر رہے، آخر حضرت شیخ نے پوچھا، آپ کا بیعت سے مدعا کیا ہے، ان کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا "اتنے بڑے عالم کا مرید ہو جاؤں گا" حضرت والا اپنی معلوم مروت کی بنا پر خاموش رہے، اور وہ اسی طرح اصرار کرتے رہے، اس وقت مجھے کسی کام کی وجہ سے چلا جانا پڑا، واپسی پر رات کو حضرت والا سے پوچھا کیا میجر صاحب بیعت ہو گئے ہیں، ارشاد فرمایا "ہم مریدین کے شکار کے پیچھے نہیں پھرتے" اور پھر فرمایا "آپ نے ان کی بات سنی تھی، ان کی نیت اپنی اصلاح کی نہ تھی"۔

اسکے بالمقابل ایک فوجی سپاہی کے خلوص اور طلب کو دیکھکر وہیں فوراً بیعت فرمالیا،

ایک طالب کو جن کی بیعت خط کے ذریعہ ہوئی تھی، حضرت نے بیعت کیلئے جو الفاظ تحریر فرمائے تھے، ان سے بیعت کے متعلق بعض چیزوں کی وضاحت ہوتی ہے، اس لیے نقل کیا جاتا ہے:

"میں آپ کو بیعت میں لینے کو تیار ہوں، اللہ تعالیٰ اس سے مجھے اور آپ کو فائدہ پہنچائیں، آپ کو جب یہ خط ملے تو بعد نماز مغرب یا جس وقت آپ کو طمانیت ہو، اچھی طرح وضو کرکے دو رکعت نماز تنہائی میں نماز توبہ کی نیت سے پڑھیں، اور پھر اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی چاہیں، اس کے بعد یہ کلمات اپنی زبان

سے ادا کریں، اور پھر مجھے اپنا پورا حال لکھیں کہ کیا ہوا، اور کیسے ہوا،

کلمات یہ ہیں: اے اللہ میں تیری طلب میں حضرت مولانا شاہ اشرف علی صاحب تھانوی کا ہاتھ انکے مجاز سلیمان ندوی کے واسطے سے پکڑتا ہوں اور اپنے کو سلسلۂ چشتیہ صابریہ میں ان کے ذریعے داخل کرتا ہوں، اے پروردگار مجھے اس راہ پر قائم رکھ اور صراط مستقیم پر لے چل اور بھٹکنے نہ دے، اے اللہ! اپنے احکام کا تابع بنا اور اپنے رسول کا متبع کر، اور اپنی محبت اور خشیت میرے دل میں ڈال اور اے پروردگار اس سلسلے کی برکات سے مجھے مستفید فرما۔

اول و آخر نماز ورنہ درود پڑھ کر ختم کریں، سلسلۂ چشتیہ صابریہ کا شجرہ مناجات مقبول میں موجود ہے، درود اور قل ہو اللہ احد اور قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس اور الحمد پڑھ کر اس کا ثواب حضرت مولانا اشرف علی اور بزرگانِ سلسلہ کو بخشیں"۔

ان ہدایات کی تعمیل کے بعد طالب نے اس کی اطلاع دی تو تحریر فرمایا:

"آپ نے وقت بیعت کا جو حال لکھا ہے وہ محمود ہے...... میں نے آپ کو چشتیہ صابریہ میں حضرت مرشدی مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ تعالیٰ کے واسطے سے داخل کر لیا، اللہ تعالیٰ اس سلسلہ کو ہم دونوں کے لیے فائدہ مند بنائیں۔

آپ نے خدا کا ہاتھ محسوس فرمایا، بیعت کی یہی حقیقت مثالی ہے، جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے ان الذین یبایعونک یبایعون اللہ ید اللہ فوق ایدیھم (الآیۃ)"

حضرت والا رحمۃ اللہ تعالیٰ تربیت و ارادت کے اس تعلق کو جانبین کے نفع کا ذریعہ سمجھتے تھے، متعدد خطوط میں اس قسم کی تحریریں ملتی ہیں، جن کے بعض اقتباسات یہ ہیں:

"میں بیعت میں آپ کو لینے کو تیار ہوں، اللہ تعالیٰ اس سے مجھے اور آپ کو فائدہ پہنچائیں"۔

"اللہ تعالیٰ طرفین کے لیے موجب سعادت بنائیں"۔

"یہ سب محبت کے آثار ہیں، اللہ تعالیٰ طرفین کو اس سے فائدہ پہنچائیں"۔

طالبین پر شفقت | حضرت سیدی و مرشدی قدس سرہ اپنے خدام و مسترشدین کے ساتھ انتہائی محبت و شفقت سے پیش آتے تھے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان رافت و رحمت کا پورا عکس حضرت والاؒ کی ہر ادا سے ظاہر ہوتا تھا۔ طالبین کی تربیت و فیض رسانی جس لطف و کرم اور تواضع و شفقت سے فرماتے تھے، اس کی مثالیں کم ملیں گی۔ ایک طالب نے لکھا "آنجناب کو روز تکلیف دیتے ڈرتا ہوں"، اس کے جواب میں غایت لطف سے تحریر فرمایا "آپ اس کا کچھ لحاظ نہ کریں، آپ کی ہر خدمت دینی ثواب ہے جس کا یہ بندہ ناکام محتاج ہے"۔

ایک طالب نے لکھا "تحریر خط کے لیے کشمکش رہتی ہے، دل شرف مکاتبت کے لیے بیتاب ہوتا ہے، لیکن ادب ہاتھ روکتا ہے"، شفیق شیخؒ نے یہ شفقت آمیز اور تسلی بخش جواب دیا "حسن ادب کا مانع مکاتبت نہیں ہے، خصوصاً جبکہ مکاتبت ازدیاد فوائد کا باعث ہو"۔

ایک طالب کو لکھتے ہیں "ظاہری ملاقات کی محرومی سے ناشاد نہ ہوں، اصلی ملاقات دلی و روحانی ملاقات ہے، جو حب فی اللہ کے ذریعہ ہر وقت حاصل ہے"۔

یہ ناکارہ جب اپنی آخری حاضری کے بعد واپس آنے لگا تو کس محبت و شفقت سے رخصت فرمایا، دعائیں دیں، معانقہ فرمایا، مصافحہ کے وقت دعائے ماثورہ استودع اللّٰہ دینکم وامانتکم وخواتیم اعمالکم عجب پرتاثیر انداز میں پڑھی، ان الفاظ پر ہی اکتفا نہ فرمایا، یہ گنہگار جب رخصت ہو کر باہر آگیا تو حضرت والاؒ برہنہ پا رخصت کرنے کے لیے باہر نکل آئے، یہ دیکھ کر دل کی عجیب کیفیت ہوئی، دعا کی درخواست کے بعد عرض کیا، حضرت کو تکلیف ہو رہی ہے، اب آرام فرمائیں، آہ کیا معلوم تھا یہ رخصتی دائمی ہے، محبت و شفقت کا یہ بے مثل منظر شیخ کی رخصتی نظر و مصافحہ اور فقیر کی اشکبار آنکھوں اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ ختم ہوا، کاش جانتا کہ یہ آخری دید ہے تو

دل بھر کے دیکھ لو یہ جمال جہاں فروز | پھر یہ جمال نور دکھایا نہ جائے گا

ایک مرتبہ ایک جلسہ کے سلسلہ میں پنڈی تشریف لائے، ایک عقیدت مند کے یہاں قیام تھا، راقم بھی ملاقات کی غرض سے حاضر خدمت ہو گیا، انتہائی مسرور ہوئے اور فرمایا "اللہ تعالیٰ ہر جگہ کوئی نہ کوئی خدمت کا بندوبست فرما دیتے ہیں"۔ رات کو میں نے اجازت چاہی کہ کسی ہوٹل میں قیام کر لوں، فرمایا "آپ فقیر آدمی ہیں یہیں پڑ رہیے"۔

اسی طرح ایک مرتبہ کراچی جا رہا تھا، حضرت والاؒ لاہور پنجاب یونیورسٹی کمیشن کی میٹنگ کے سلسلہ میں آئے ہوئے تھے، مجھے علم نہ تھا۔ لاہور ریلوے اسٹیشن پر میرے کاندھے پر کسی نے ہاتھ رکھ دیا، پلٹ کر دیکھا تو حضرت شیخ کا پرنور چہرہ اور متبسم نگاہیں نظر آئیں، اس وقت مجذوبؒ کے اس شعر کا منظر نگاہ کے سامنے آگیا،

چمکتی ہیں آنکھیں دمکتا ہے چہرہ | جواں آج پیر مغاں ہو رہا ہے

پھر بحمد اللہ تعالیٰ کراچی تک کی ہمسفری کی سعادت نصیب ہوئی،

مکاتیب | حضرت والاؒ کے مکاتیب بھی محبت و شفقت، رافت و رحمت کا گنجینہ ہوتے تھے، اور ان کا ہر ہر لفظ لطف و رحمت اور طالبین کے درد دل کیلیے مرہم شفا ہوتا تھا، حضرتؒ کے مکاتیب کی شان ان کے اشعار سے ظاہر ہوتی ہے، جو انھوں نے اپنے شیخ کے مکاتیب کی ثنا و صفت میں لکھے تھے،

آج آیا ہے پیارے کا پیارا مکتوب | دلکش و دلبر و دلچسپ و دلآرا مکتوب

قوت جان، قوت دل، سرمہ بینش تحریر | روح افزا و دل آویز و دلارا مکتوب

روشنائی نظر آئے گی سواد خط میں | دیدۂ کور بھی دیکھے جو تمھارا مکتوب

پڑھ لے کوئی تو معطر ہو مشام دل و جاں | نافۂ مشک ہے یا عنبر سارا مکتوب

سر بسر شوق و ہمہ درد ہماری تحریر | سر بسر مایۂ تسکین ہے تمھارا مکتوب

نامۂ یار کے دیدار میں عالم یہ ہے | ہمہ تن آنکھ ہوں اور آنکھ کا تارا مکتوب

سالکین کی تربیت بڑا دقیق فن ہے، حضرت والاؒ کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس فن میں اتنی مہارت، بصیرت، دقت نظر، تاثیر اور برکت عطا فرمائی تھی کہ سالک نے اپنا کوئی حال لکھا اور حضرت شیخ کی جوابی تحریر نے اس حال کو بہتر حال سے بدل دیا

نسخۂ اکسیر و دارُوئے شفا تیرے ہاتھوں کا لکھا مکتوب ہے

اس تاثیر پر ایک طالب نے لکھا "حضرت والا کے خطوط بندہ کے حق میں شفا و مرہم کا حکم رکھتے ہیں ... ایک خاص قسم کی طمانیت حاصل ہوتی ہے، اور اکثر دیکھا ہے کہ ایک حالت کا غلبہ تھا اور حضرت کے جواب پڑھنے سے وہ حالت بہتری کی طرف فوراً منتقل ہوگئی"، متواضع شیخ نے اسکے جواب میں لکھا:

"یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت اور آپ کی محبت ہے"

حکمت و عرفانِ سلیمانی کا بڑا ذخیرہ حضرتؒ کے مکاتیب و ملفوظات سلیمانی میں بکھرا ہوا ہے[1]، کاش متوسلین اس قیمتی ذخیرہ کو جمع کرکے اس کا فیض عام کرتے۔

حضرت شیخؒ کے نزدیک شیخ و مرید کی مثال معالج و مریض کی ہے، طالبین اپنے امراض تحریر کرتے ہیں اور شیخ اسکا علاج بتلاتا ہے، ایک طالب کو تحریر فرماتے ہیں: "لیکن اپنی کمیوں اور نقائص کے متعلق مجمل و مبہم بیان علاج کے لیے کافی نہیں ہے۔ آپ اپنے نفس کے متعلق غور کیجیے اور متعین کیجیے کہ وہ نقائص کیا ہیں، تاکہ ان کا علاج کیا جا سکے جس طرح طبیب سے صرف یہ کہنا کافی نہیں کہ میں بیمار ہوں، جب تک یہ نہ بتایئے کہ کیا کیا بیماریاں اور تکلیفیں ہیں، کھانسی ہے، درد سر ہے، ضعف معدہ ہے، بے خوابی ہے۔

اس سلسلہ میں ایک طالب کو تحریر فرمایا کہ "اپنے عیوب و نقائص جاننے کا طریقہ یہ ہے:

یک زمانے درکمیں خویش باش

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِہٖ بَصِیْرَۃٌ وَّلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَہٗ

(باقی)

---

[1] راقم کا خیال ہے کہ اگر حضرتؒ کے خادمین تعاون کریں تو اس مجموعہ کو اکٹھا کر دیا جائے، وما توفیقی الا باللہ اس سلسلہ میں کوئی چاہے تو فقیر سے خط و کتابت کرسکتا ہے، احسان ہوگا۔

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی فوج میں سواروں کے کارنامے

از جناب سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب ایم اے

(۳)

قندھار کی مہم اورنگ زیب نے اپنی سپہ سالاری اور سپہگری کا جوہر قندھار جا کر بھی دکھایا، ۱۰۵۹ھ میں قندھار کی تسخیر کے لیے شاہجہاں نے جب سعد اللہ خاں اور اورنگ زیب کو بھیجا تو ان کے ساتھ پچاس سے ساٹھ ہزار تک فوج تھی، اس مہم میں جتنے سوار اور لشکری شریک ہوئے ان کو تنخواہ کے علاوہ سو روپے زیادہ دیے گئے، پھر منصبداروں اور احدیوں کو تین تین مہینہ کی تنخواہ پیشگی دیدی گئی اور فوج بھیرا، بنگش، کوہاٹ، جمرود، جلال آباد، کابل، غزنین، قلات اور غلزئی کے دشوار گذار راستوں سے گذر کر قندھار پہنچی، پہلے تو ایرانیوں نے قلعہ کے اندر محصور ہو کر ہندوستان کی فوج کا مقابلہ کیا، لیکن جب بالا حصار کے پاس شاہ میر میں دونوں فوجوں کا مقابلہ میدان میں ہوا تو ہندوستانی لشکر کے سواروں اور ہاتھیوں نے مل کر غنیم کے چھکے چھڑا دیے، ایرانیوں کی فوج میں تیس ہزار قزلباش سوار تھے لیکن ہندوستانی سواروں کی تعداد کل دس ہزار تھی، دونوں جانب توپچیوں کے علیحدہ علیحدہ دستے تھے، البتہ ہندوستانیوں کے پاس جو جنگی ہاتھی تھے وہ ایرانیوں کے لشکر میں نہ تھے، گو

اور بان پھینک پھینک کر جنگ شروع ہوئی، اور جب لڑائی میں گرمی پیدا ہوئی تو دونوں طرف کے سوار آگے بڑھے، قزلباش سواروں نے گھوم گھوم کر ہندوستانی فوجوں کو اپنی گود میں لے لینا چاہا، لیکن ہندوستانی فوج کے سوار اس طریقۂ جنگ سے اچھی طرح واقف تھے، اس لیے سواروں میں سے سادات، افغان، مغل اور راجپوتوں نے گھوڑے بڑھا کر ان کی یورش روکی، گو وہ تعداد میں کم تھے، لیکن اپنی شجاعت اور نبرد آزمائی کے زعم میں ان کا مقابلہ کرتے رہے، قزلباشوں نے شجاعت کا پورا جوہر دکھایا، دونوں طرف سے سواروں کی "چپقلش مردانہ" کا حال یہ تھا کہ

"از گرد و غبار سم اسپاں ہر دو طرف جہاں در چشم دل باختگان سیاہ و تیرہ گردید"[1]

ہندوستانی فوج خون جگر بہا رہی تھی کہ اورنگ زیب کا ایک سردار رستم خاں اپنے ہاتھی کے پاؤں میں زنجیر ڈال کر اپنے سواروں کی مدد کو پہنچا، اس کے ساتھ دوسرے سوار بھی تھے، رستم خاں مارتا کاٹتا دشمن کے قلب میں گھس گیا، اس یورش میں بہت سے ہندوستانی فوجی سردار ہلاک ضرور ہوئے لیکن دشمن کے پاؤں اکھڑ گئے، اور وہ میدان جنگ میں ٹک نہ سکے، اور جب اس فتح کا مژدہ شاہجہاں کے پاس پہنچا تو ہندوستان کے دارالسلطنت میں تین دن تک شادیانے بجائے گئے[2]،

اورنگ زیب کو بدخشاں، بلخ اور قندھار میں کامیابی تو ہوئی، لیکن یہ علاقے شاہجہانی عہد ہی میں ہندوستان سے کٹ گئے، جہاں تک ہندوستانی سواروں کی نبرد آزمائی کا تعلق تھا، وہ بدخشاں، بلخ اور قندھار کے سواروں سے زیادہ بہادر، شجاع اور تربیت یافتہ ثابت ہوئے، اسی لیے ان کا مقابلہ میدانی لڑائیوں میں کم کیا گیا، لیکن ہندوستانی گوریلا اور قزاقانہ جنگ کے عادی نہ تھے، اس لیے ایسی لڑائیوں میں وہ اپنے غنیم پر ضرب کاری نہ لگا سکے، اس کے علاوہ محاصرہ کی جنگ میں ہندوستانی توپیں زیادہ کارگر اور موثر ثابت نہ ہوئیں، کیونکہ ان کے غنیم خصوصاً ایرانیوں کی توپیں ان سے زیادہ بہتر اور اچھی تھیں، پھر ان علاقوں میں ہندوستانی فوجوں کے لیے خاطر خواہ رسد بھی نہیں ملی، اس لیے

[1] خافی خاں ص ۶۰۹ [2] ایضاً

ان کے کیمپ کو برابر قحط کا سامنا کرنا پڑا، پھر ہندوستانی فوجیں برفانی علاقوں میں رہنے کی عادی نہ تھیں، اس لیے جب جب وہ برفانی علاقوں سے گذریں تو بے شمار جانیں تلف ہوئیں، بلخ کی واپسی میں شاہی لشکر دریائے سرخاب اور کوہ ہندوکش سے گذرا تو دس ہزار لشکری، ہاتھی، گھوڑے، اونٹ اور دوسرے جانور برف کے تودوں میں دفن ہو کر رہ گئے، دارا اور اورنگ زیب کی چشمک اور فوجی سرداروں کی رقابتوں سے بھی ان علاقوں کی مہم کو نقصان پہنچا، اورنگ زیب ان علاقوں کی تسخیر کے لیے بھیجا ضرور جاتا، لیکن اس کو اختیارات زیادہ نہیں دیے جاتے تھے، اور جب وہ اپنی خواہش کے مطابق کوئی جنگی کارروائی کرنا چاہتا تو اس کو روک دیا جاتا، یا واپس بلا لیا جاتا، اس میں بہت کچھ دارا شکوہ کو دخل رہتا، ان علاقوں کی فوج کشی میں شاہی خزانہ پر بڑا بار پڑا، اس لیے آخر میں شاہجہاں ان پر حکومت کرنے کے خیال سے دست بردار ہو گیا، لیکن ہندوستانی فوجوں نے یہاں سے باہر نکل کر اپنی بہادری، شجاعت اور جانبازی کے جو جوہر دکھائے وہ اس کی تاریخ میں ایک زریں مثال ہے،

راجپوت سوار

قندھار، بلخ اور بدخشاں کی مہم میں راجپوت سواروں نے بھی اپنی سپہگری کے جوہر دکھائے، وہ تیموری بادشاہوں کے لشکر کا ضروری جز بن گئے تھے، اور ہر چھوٹی بڑی مہم میں ضرور شریک رہتے تھے، گو کچھ راجپوت ایسے ضرور تھے جو برابر مغل سلطنت پر ضرب کاری لگانے کی فکر میں لگے رہے، لیکن مغل حکمرانوں نے ایسے راجپوتوں کی معاندانہ اور مخالفانہ روش کو ہمیشہ نظر انداز کیا، اور اپنی غیر معمولی رواداری، وسعت قلب، بلند حوصلگی اور سیاسی فیاضی کا ثبوت دے کر راجپوتوں کو ہر زمانہ میں اپنانے کی کوشش کی، کنواہا کے میدان میں رانا سانگا تمام راجپوتوں کو جمع کر کے بابر کے خلاف اس لیے صف آرا ہوا کہ وہ راجپوتوں کی حکومت کا خواب پھر دیکھنے لگا تھا، لیکن وہ بری طرح پسپا ہوا، اس کی پسپائی کے بعد بابر نے اس کے لڑکے بکرماجیت اور اس کی بیوی

پدماوتی کو ستر لاکھ کی جاگیر واگذاشت کی، اور ایک دوسرے لڑکے کو شمس آباد عطا کیا۔[1]

۹۳۶ھ/۱۵۲۱ء میں ہمایوں نے چندیل راجپوتوں کے راجہ کے خلاف کالنجر پر حملہ کیا، مگر اس قلعہ کی تسخیر کے بعد راجہ کو اپنے خیرخواہوں اور امراء کے زمرہ میں داخل کر لیا، طبقات اکبری میں ہے،

"راجہ آنجا (کالنجر) از راہ انقیاد و عبودیت پیش آمدہ، داخل دولت خواہاں شد" (ج ۲ ص ۳۰)

اکبر نے راجپوتوں کے دلوں کو جس طرح تسخیر کیا، وہ تاریخ ہند کا ایک زریں باب ہے، راجہ بہارا مل کچھواہا، اکبر کی محبت و الفت کا دم اتنا بھرتا تھا کہ اس کو اپنی لڑکی دے کر اس سے قرابت بھی قائم کر لی، اس رشتہ سے کچھواہہ کے بہت سے افراد اعلیٰ مدارج پر پہنچ گئے، خود اکبر راجہ بہارا مل کا بڑا لحاظ رکھتا تھا، ۹۸۰ھ میں جب وہ گجرات کی مہم پر گیا تو فتح پور میں راجہ بہارا مل ہی کو وکیل مطلق بنا کر چھوڑ گیا۔[2]

راجہ بہارا مل کا لڑکا راجہ بھگوان داس تو ترقی کر کے اکبر کا پنجہزاری پنجہزار سوار منصبدار بن گیا تھا، وہ آخر وقت تک اکبر کے دام اخلاص و محبت کا اسیر رہا، اکبر کے ساتھ رانا میواڑ کے خلاف جنگ کر کے اپنے قلبی تعلق کا ثبوت دیا، چتوڑ کے محاصرہ میں راجہ بھگوان داس کے ساتھ رائے پتر داس اور راجہ ٹوڈرمل بھی تھے، ابو الفضل کا بیان ہے کہ اس مہم کے آغاز میں رانا اودے سنگھ کا لڑکا سکت سنگھ بھی اکبر کے ہمرکاب رہا، لیکن بعد میں وفادار ثابت نہ ہوا۔[3]

۹۷۹ھ میں جب اکبر گجرات کی مہم پر گیا تو راجہ بھگوان داس اور راجہ مان سنگھ بھی اس کے ساتھ تھے، لڑائی کے موقع پر اکبر اپنے خاص گھوڑے نور بیضا، پر سوار ہو کر میدان جنگ جانے لگا تو گھوڑا یکایک بیٹھ گیا، سب ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے کہ شگون اچھا نہیں ہوا، لیکن راجہ بھگوان داس نے فراست سے کام لیا اور آگے بڑھ کر اکبر سے مخاطب ہو کر بولا، "فتح مبارک ہو" اکبر نے سنکر کہا

[1] بابر نامہ ص ۳۳۳ [2] مآثر الامراء ج ۲ ص ۱۳ [3] اکبر نامہ ج ۲ ص ۳۲۳-۳۱۶-۳۰۷

سلامت باشید، یعنی یوں، راجہ نے جواب دیا کہ ہمارے شاستر میں لکھا ہے کہ جب فوج مقابلے کو تیار ہو اور سپہ سالار کا گھوڑا سواری کے وقت بیٹھ جائے تو فتح اسی کی ہوگی، یہ سنکر تمام لشکریوں میں مسرت کی لہر دوڑ گئی، جب جنگ شروع ہوئی تو اکبر، راجہ بھگوان داس کے ساتھ ایک ٹیلہ پر کھڑا ہو کر جنگ کا معائنہ کر رہا تھا کہ راجہ بھگوان داس سے مخاطب ہو کر کہا کہ ہراول پر دباؤ زیادہ ہے، طور بے طور ہوا چاہتا ہے، اپنی فوج تھوڑی اور غنیم کا ہجوم زیادہ ہے، چلو ہم تم مل کر جا پڑیں کہ پیچھے سے مشت کا صدمہ زیادہ پڑتا ہے، یہ کہکر دونوں نے گھوڑوں کی باگ اٹھائی، اور ان کا یہ دھاوا کامیاب رہا۔[1]

اسی جنگ میں اکبر ایک مقام پر کھڑے ہو کر دشمنوں پر تیر چلا رہا تھا، اور راجہ بھگوان داس اور مان سنگھ اس کے پاس تھے کہ دشمن کے تین لشکری آگے بڑھے، ایک راجہ بھگوان داس کی طرف لپکا اور دو اکبر پر حملہ آور ہوئے، راجہ بھگوان داس نے اپنا گھوڑا بڑھایا، دشمن نے گھوڑے پر سے راجہ پر تیر چلایا لیکن راجہ نے وار بچا کر برچھا مارا اور وہ زخمی ہو کر بھاگا، راجہ مان سنگھ اکبر کی مدد کے لیے پہنچنا ہی چاہتا تھا کہ اکبر نے للکارا کہ وہ اپنی جگہ سے آگے نہ بڑھے، اور خود اپنا گھوڑا اڑا کر دونوں دشمنوں کو نرغے میں لینا چاہا، راجہ بھگوان داس نے چلا کر راجہ مان سنگھ سے کہا کھڑے ہوئے کیا دیکھتے ہو، آگے بڑھو، راجہ مان سنگھ نے کہا مہابلی خفا ہوتے ہیں، راجہ نے جھلا کر کہا یہ وقت خفگی دیکھنے کا نہیں ہے، اس عرصہ میں اکبر نے دونوں دشمنوں کو مار بھگایا،

اسی لڑائی میں راجہ بھگوان داس کے بھائی[2] نے اکبر کو دشمنوں کے نرغے سے بچانے میں بہادری کا ایسا کارنامہ دکھایا کہ فرشتہ کا بیان ہے کہ رستم و اسفندیار کی ساری داستان بھلا دی گئی، اور آخر کار خود بھی کام آیا۔[3]

اسی لڑائی میں جب اکبر اپنی فوج کی صفیں درست کر رہا تھا تو دیکھا کہ راجہ بہارا مل کا بھتیجا

[1] بدایونی کا بیان ہے کہ راجہ بھگوان داس (بھگونت داس) کا لڑکا بھوپٹ رائے تھا (ج ۳ ص ۴۳)
[2] فرشتہ ج ۱ ص ۲۵۹

راجہ جے مل کچھواہا ایک وزنی بکتر پہنے ہوئے ہے، اکبر نے وہ بکتر اتروا لیا اور اپنی خاصہ کی زرہ پہنوا دی، راجہ جے مل اس رعایت خصوصی سے بہت مسرور ہوا، تھوڑی دیر کے بعد اکبر نے راجہ مالدیو (جودھپور) کے پوتے راجہ کرن کو دیکھا کہ اس کے پاس نہ زرہ ہے نہ بکتر، اس نے راجہ جے مل کا بکتر اس کو پہنوا دیا، راجہ جے مل کا باپ روپ سی بھی لڑائی میں شریک تھا، اس کو یہ ناگوار گذرا، کیونکہ راجہ کرن کے خاندان سے اس کی پشتینی عداوت چلی آرہی تھی، اس نے اکبر کو کہلا بھیجا کہ وہ بکتر میرے بزرگوں کی یادگار ہے اور بڑا مبارک ہے، اس لیے مجھکو واپس کر دیا جائے، اکبر معاملہ کی تہ کو پہنچ گیا، اور روپ سی کے پاس کہلا بھیجا کہ خاصہ کی زرہ اور بھی مبارک ہے، لیکن راجہ روپ سی کا غصہ فرو نہ ہوا، اور اس نے اشتعال میں اسلحہ جنگ اتار کر پھینک دیے اور کہا کہ میدان جنگ میں یونہی جاؤں گا، اکبر کو یہ معلوم ہوا تو اس نے اپنی زرہ بھی اتارنے کا ارادہ کر لیا کہ جب میرے لشکری برہنہ ہو کر لڑیں گے تو میں کیونکر زرہ بکتر میں چھپکر میدان جنگ میں جا سکتا ہوں، راجہ بھگوان داس کو اس کی خبر ملی تو فوراً گھوڑا بڑھا کر جے مل اور روپ سی کے پاس پہنچا، اور دونوں کو سمجھا کر، ہتھیار لگوا کر اکبر کے پاس لایا، اور عرض کیا کہ روپ سی نے آج بھنگ زیادہ پی لی تھی، اسی کی لہر کی ترنگ میں تھا یہ سنکر اکبر کا تردد جاتا رہا[۱]۔

اکبر کی دلداری اور خاطرداری کے سبب سے راجہ مان سنگھ اور اس کے لڑکے راجہ ہمت سنگھ اور راجہ جگت سنگھ نے جو جنگی کارنامے انجام دیے ہیں، وہ تیموریوں کی تاریخ کی نمایاں چیز ہے، راجہ مان سنگھ کو اکبر غایت محبت میں مرزا راجہ کہا کرتا تھا، اسی کی نگرانی میں شاہی فوج راجپوتانہ میں رانا پرتاب کے اور بہار میں پورن مل اور راجہ سنگرام اور اڑیسہ میں پوری کے راجہ کے خلاف بھیجی گئی، پھر کابل زابلستان، بہار اور مشرقی بنگال میں جا کر اکبری اقبال کا پرچم لہرایا، اکبر نے جب اس کو ہفت ہزاری

[۱] ماثر الامراء جلد ۲ ص ۱۱۱

منصبدار کا اعزاز عطا کیا ہے تو اس وقت تک یہ اعزاز کسی مسلمان منصبدار کو بھی نہیں ملا تھا[۱]، راجہ مان سنگھ سے پہلے کبھی کوئی فوج کسی ہندو فوجی سردار کی نگرانی میں کہیں نہیں بھیجی گئی تھی، اور نہ کسی ہندو فوجی سردار نے مسلمانوں کے خلاف اپنی رہنمائی میں لشکر کشی کی تھی، لیکن اکبر نے مان سنگھ کو اپنے سر آنکھوں پر بٹھا کر مسلمانوں کا سارا رعب ہندوؤں کے دلوں سے نکال دیا،

اکبر کے طلسم محبت میں گرفتار ہونے والوں میں جودھپور کے راجہ اودے سنگھ راٹھور عرف موٹہ راجہ کا نام بھی نمایاں ہے، اس نے اپنی لڑکی مان متی عرف جگت گسائیں کا بیاہ شہزادہ سلیم سے کر کے اکبر سے اپنی قلبی محبت کا اظہار کیا، یہ راجپوت شہزادی جودھا بائی کے نام سے تاریخوں میں مشہور ہے، اس قرابت کے بعد راجہ اودے سنگھ نے اکبر کی بہت سی مہموں میں فوجوں کی رہنمائی کی، بندیلہ کے راجہ مدھکر اور سروہی کے راجہ کی تادیب بھی اسی کی نگرانی میں کی گئی[۲]،

اکبر کے جاں نثاروں میں رائے رائے سنگھ بیکانیری بھی تھا، اس نے بھی اپنی ایک لڑکی شہزادہ سلیم کے عقد میں دی، اور تمام عمر اکبر کی خدمت میں گزاری، ۱۹ سنہ جلوس میں مالدیو کے راجہ چندرسین کی سرکوبی کے لیے مامور ہوا، جالور اور سروہی کے راجہ کے مقابلہ کے لیے بھی وہی بھیجا گیا، ۲۱ سنہ جلوس میں رانا پرتاب کے خلاف جو مہم بھیجی گئی اس میں بھی رانا کے خلاف رائے سنگھ کی تلوار نیام سے باہر ہوئی تھی، اکبر نے اس کو چار ہزاری کا اعزاز بخشا تھا اور جہانگیر نے منصب پنجہزاری پر سرفراز کیا[۳]،

راجہ ٹوڈرمل بھی اکبر کا بڑا خیرخواہ تھا، گو تاریخوں میں اس کا نام ایک ماہر مالیات کی حیثیت سے آتا ہے، لیکن اس نے میدان جنگ میں بھی بہادری کے جوہر دکھائے،

۹۸۲ھ میں اکبری فوج بنگال کے داؤد خاں کے خلاف صف آرا ہوئی تو جرانغار یہ

[۱] ماثر الامراء ج ۲ ص ۱۷۰ - ۱۶۰ [۲] ایضاً [۳] ایضاً ص ۱۴۷ - ۱۴۸

راجہ ٹوڈرمل بھی دوسرے فوجی سرداروں کی طرح تھے جب لڑائی زوروں سے ہو رہی تھی تو داؤد خاں کے لشکر کے مقابلہ میں شاہی فوج کے قلب اور برانغار کمزور پڑنے لگے، اور پسپائی کے آثار ظاہر ہونے لگے، کچھ لشکریوں نے یہ خبر راجہ ٹوڈرمل کے بازو تک پہنچائی، ٹوڈرمل نے بڑھ کر اپنے لشکریوں کو للکارا:

"شاہنشاہ کے اقبال کا سایہ ہمارے بہادر لشکریوں کی پیشانی پر پڑ رہا ہے، اگر کسی کا قدم ڈگمگا گیا ہے تو سلطنت کے دوسرے بہادروں کو پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے، لغو بات سننے اور کہنے کا یہ موقع نہیں، ہماری فتح لکھی ہوئی ہے اور کامرانی کے آثار سامنے ہیں"

یہ کہکر خود میدان کارزار میں کود پڑا، اور اس کے پیچھے دوسرے بہادر سردار اور لشکری بھی بڑھے، اور جنگ کا نقشہ ہی بدل گیا، اور اکبری فوج اپنے دشمن پر غالب رہی، اس جنگ میں بابائے کلابی، مقصود علی، میر یوسف آب بارانی، حسین بیگ کرد جیسے فوجی سرداروں نے ٹوڈرمل کی سرداری اور قیادت قبول کرنے میں مطلق تامل نہیں کیا[1]، گجرات، بہار اور بنگال میں کئی لڑائیاں اسی کی نگرانی میں لڑی گئیں، وہ اکبر کے چار ہزاری منصبداروں میں تھا،

میواڑ کے رانا پرتاب سنگھ نے اکبر کی سلطنت کو اکھاڑ پھینکنے میں جو کوشش کی وہ ایک افسانہ بن گیا ہے، پھر کرنل جیمس ٹاڈ نے اپنی مشہور و معروف تاریخ *Annals and antiquities of Rajasthan* میں اس کی حب الوطنی، قومی غیرت اور مسلم دشمنی کا جو راگ الاپا ہے اس کا مقصد ہندوؤں اور مسلمانوں میں محض افتراق اور نفاق پیدا کرنا ہے، ٹاڈ کا بیان ہے کہ رانا پرتاب کو انتہائی دکھ تھا کہ راجستھان میں ترکوں کے قوانین رائج ہو گئے[2]، وہ راجپوتوں کی حمیت ابھار کر پیروان اسلام سے ہندوستان کی حکومت چھیننا چاہتا تھا[3]، وہ راجہ مان سنگھ سے اس لیے نفرت کرتا تھا کہ اس نے ایک ترک کو اپنی بہن دی، اور ایک ترک کے ساتھ کھانا کھایا،

---

[1] اکبر نامہ ج ۳ ص ۱۲۵ [2] ٹاڈ ج ۱ ص ۲۶۸ [3] ایضاً

اودے ساگر میں راجہ مان سنگھ نے رانا پرتاب سے ملنے کی کوشش کی تھی لیکن رانا اس سے نہیں ملا، اور جب راجہ مان سنگھ چلا گیا تو اس زمین کو گنگا جل سے دھوکر پوتر کیا گیا اور وہاں کے لوگوں نے اشنان کر کے اپنے کو پاک کیا، اور یہ اس لیے کہ راجہ مان سنگھ ترکوں کا دوست تھا[1]، ٹاڈ کی ان گھڑت داستانوں نے رانا پرتاب کے کیرکٹر میں ایک افسانوی اور رومانی رنگ ضرور پیدا کر دیا ہے لیکن اس کو حقیقت سے بہت کم علاقہ ہے، اور اگر ٹاڈ کے بیانات کو صحیح مان لیا جائے، تو یہ ماننا پڑے گا کہ رانا پرتاب نے گو راجپوتوں کو اکبر کے خلاف ابھارنے کی پوری کوشش کی، مگر اکبر کی رواداری، ہر دلعزیزی، صلح جوئی، محبت اور اخلاص کے مقابلہ میں وہ اپنے مشن میں ناکام رہا، خود ٹاڈ کا بیان ہے کہ مارواڑ، امبر، بیکانیر، بندی کے راجپوت راجاؤں اور خود رانا پرتاب کے بھائی ساگر جی نے اس کو چھوڑ کر اکبر کا ساتھ دیا[2]، اور جب ہلدی گھاٹ میں رانا پرتاب اور اکبر کی فوجوں میں تصادم ہوا تو اکبری فوج کی کمان راجہ مان سنگھ کے ہاتھ میں تھی، ٹاڈ نے اس جنگ کا ذکر بہت ہی ولولہ انگیز طریقہ پر کیا ہے، حالانکہ تیموری دور کے مورخین نے اس جنگ کو زیادہ اہمیت نہیں دی ہے[3]، پھر ٹاڈ نے اس لڑائی کی تفصیل لکھنے میں بہت سی غلط بیانیوں سے کام لیا ہے، وہ لکھتا ہے کہ اکبری فوج کی رہنمائی شہزادہ سلیم نے کی، حالانکہ اس مہم کے وقت اس کی عمر کل سات سال کی تھی، وہ ۹۷۷ھ میں پیدا ہوا، اور یہ لڑائی ۹۸۴ھ ۱۵۷۶ء میں ہوئی، اور جب شہزادہ سلیم کی شرکت کا کوئی امکان ہی نہیں ہے تو پھر ٹاڈ کا یہ لکھنا کس قدر مضحکہ خیز ہے کہ رانا پرتاب سلیم کے ہاتھی کی طرف بڑھ جانے کو بڑھا، اور قریب تھا کہ اکبر کو اس کے وارث سے محروم کرے کہ شہزادہ کا ہاتھی سراسیمہ ہو کر بھاگا، جس کے بعد اکبری فوج نے شہزادہ کو بچانے میں پوری جنگ کی، ٹاڈ کا بیان ہے کہ رانا پرتاب کے جسم پر سات زخم لگے اور اس کے بعد وہ میدان چھوڑ کر اپنے گھوڑے چیتک پر بھاگا، اکبر کے بعض سواروں نے اس کا پیچھا کیا،

---

[1] ٹاڈ ج ۱ ص ۲۶۱ [2] ایضاً ص ۲۵۰ [3] دیکھو اکبر نامہ ج ۳ ص ۱۷۵-۱۷۷

جس میں اس کا بھائی شکت بھی تھا، مگر سکت نے جب بھائی کو اس طرح جان بچا کر بھاگتے دیکھا تو اس کی برادرانہ محبت جوش میں آگئی، اس لیے اپنے ہمراہی سواروں کو راستہ میں برچھے سے ہلاک کر دیا، اور بھائی کے گلے سے جا کر لپٹ گیا، لیکن وہ شہزادہ سلیم کی رکاب میں تھا، اس لیے بھائی کو چھوڑ کر پھر سلیم کے پاس چلا آیا، اور غلط بیانی سے کام لے کر اپنی وفاداری کا یقین دلانا چاہا، سلیم نے اس کو معاف تو کر دیا، مگر اپنے پاس سے علیحدہ کر دیا، مگر جب شہزادہ سلیم جنگ میں شریک ہی نہیں ہوا تو یہ ساری داستان من گھڑت ہی ہے، جس کا تاریخی حقایق سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

ٹاڈ کا بیان ہے کہ اس جنگ میں رانا پرتاب کے ساتھ ۲۲ ہزار راجپوت تھے، جو دشوار گذار پہاڑی وادیوں اور دروں میں چھپ چھپ کر آگرہ کی فوج کا مقابلہ کرنے آتے تھے، جو تعداد میں بہت کم تھی، لیکن اس جنگ میں چودہ ہزار راجپوت مارے گئے، اور صرف رانا پرتاب اپنے وفادار گھوڑے چیتو کی تیز گامی کے بدولت بچ نکلا، ابوالفضل کا بیان ہے کہ اس جنگ میں اکبری فوج کے کل ۱۵۰ آدمی مارے گئے، جن میں انتہائی بہادری سے لڑ کر جان دینے والوں میں راجہ رام ساہ، سال بہان، بھان سنگھ اور پرتاب سنگھ بھی تھے، اس جنگ میں کنور مان سنگھ نے جو جوہر دکھائے، ابوالفضل نے خاص طور پر اس کی تعریف کی ہے، مان سنگھ کے علاوہ اس لڑائی میں اکبری فوج کے دوسرے راجپوت سردار کے نام یہ تھے، رائے لون کرن، جگناتھ، مادھو سنگھ[1]

رانا پرتاب کی موت اس ذہنی خلجان میں ہوئی کہ وہ اکبر سے انتقام لیکر اپنے غیظ و غضب کو ٹھنڈا نہ کر سکا، لیکن اکبر اطمینان اور سکون کی موت مرا کہ اس نے راجپوتوں اور ہندوؤں کے دلوں کو موہ کر اپنی حکومت کے ذریعہ ہندوستان کو ایک مرکزیت دی، بکھرے ہوئے جغرافیائی علاقوں کو متحد کیا اور ایک مرکزی نظام کی یکسانیت عطا کی، ہندو اور خصوصاً راجپوت اس کو اپنے قلوب کا فاتح اور اکی

[1] اکبر نامہ ج ۳ ص ۷۷۴

سلطنت کو اپنی ہی سلطنت سمجھتے رہے، ۹۸۲ھ میں راجہ ٹوڈرمل جب داؤد خاں کے خلاف میدان جنگ میں لڑ رہا تھا تو اپنے ساتھیوں کو یہ کہکر ابھارتا تھا کہ سلطنت ہماری ہے اسکی فتح ہماری فتح ہے[1]

اکبر نے راجپوتوں کے لیے فراخ حوصلگی اور دلداری کی جو روایت قائم کی، اس کو اس کے جانشینوں نے بھی برابر برقرار رکھنے کی کوشش کی، جہانگیر کی رگوں میں تو راجپوت کا خون آہی چکا تھا، اسلیے راجپوتوں کی خاطرداری میں اکبر سے بھی کچھ آگے بڑھا ہوا تھا، اور اس کے سارے لشکریوں میں بھی راجپوتوں سے دوستی اور یگانگت کا جذبہ پیدا ہوگیا تھا، اور جب کبھی ان کی دل شکنی ہوتی تو تمام ارباب حل و عقد ان کے قلوب کی تالیف میں پوری ہوشمندی اور عاقبت اندیشی سے کام لیتے، جہانگیر کے اٹھارہویں سنہ جلوس میں شاہی فوج مہابت خاں کی کمان میں دکن میں مقیم تھی، سادات بارہہ میں سے سید کبیر کے ایک بھائی نے اپنی تلوار ایک صیقل گر کو صیقل کرنے کو دی، صیقل گر کی دوکان لشکر کے ایک دوسرے فوجی سردار کچھواہا کی قیام گاہ کے پاس تھی، صیقل کی اجرت میں صیقل گر اور سید کبیر کے بھائی میں جھگڑا ہونے لگا، سید کے ملازموں نے غصہ میں آکر صیقل گر کو دو تین لکڑیاں مار دیں، راجہ گردھر کے راجپوت سپاہیوں نے صیقل گر کی حمایت کی، اور سید کے نوکروں کو زد و کوب کیا، اور یہاں تک بات بڑھ گئی کہ فریقین میں تلواریں چلنے لگیں، سید کبیر کو معلوم ہوا تو کچھ سواروں کا دستہ لیکر پہنچ گئے، اور راجہ گردھر کی قیام گاہ کو گھیر لیا، اور غصہ میں اندر گھس کر تلوار چلانے لگے، راجہ گردھر نے بھی اپنی تلوار سونت لی، لیکن وہ چھبیس راجپوتوں کے ساتھ ہلاک ہوا، سید کبیر کی طرف بھی چار سید مارے گئے، یہ خبر پھیلی تو لشکر کے راجپوت ایک طرف جمع ہوگئے، اور دوسری طرف سادات بارہہ اکٹھا ہوئے، اور قریب تھا کہ دونوں میں کشت و خون ہو جائے کہ مہابت خان کو خبر ہوگئی، وہ موقع واردات پر پہنچا اور اپنی حکمت عملی سے دونوں کے اشتعال کو فرو کیا، پھر راجہ گردھر کی قیامگاہ پر جا کر اس کے لڑکوں سے

[1] آئین اکبری انگریزی ترجمہ ا ص ۳۷۶

تعزیت کی، بعد میں سید کبیر گرفتار ہوئے، اور محض راجہ گردھر کے لڑکوں اور راجپوتوں کی تسلی کی خاطر سید کبیر قصاص میں قتل کر دیے گئے۔[1]

سادات بارہہ فوج کی ریڑھ کی ہڈی سمجھے جاتے تھے، ان کے بہادرانہ کارناموں سے تیموریوں کی پوری تاریخ معمور ہے، لیکن راجپوتوں کی خاطر سادات بارہہ کی خفگی کا خیال مطلق نہیں کیا گیا اور ان کے ایک بہادر فرد کو محض راجپوتوں کی دلجوئی کے لیے تہ تیغ کر دیا گیا،

اکبر اور جہانگیر کی رواداری، فراخ حوصلگی اور ہندو نوازی اور راجپوتوں کی دوستی، وفاداری اور یگانگت سے ہندوستان میں جو ایک سیکولر حکومت قائم ہو گئی تھی، اس کے خلاف رانا پرتاب کے خاندان والوں نے اپنی معاندانہ سازشیں اور تخریبی کارروائیاں برابر جاری رکھیں، جہانگیر نے بھی انکی سرکوبی کے لیے سیکولر طریقے اختیار کیے، چنانچہ اپنی جانشینی کے پہلے سال رانا امر سنگھ کے خلاف جو لشکر بھیجا، اس کے فوجی سرداروں میں راجہ بہار امل کا لڑکا پنج ہزاری منصبدار راجہ جگناتھ، خود راجہ امر سنگھ کا چچا رانا ساگر،[2] راجہ مان سنگھ کا بھتیجا مادھو سنگھ، اور اس کا پوتا مہا سنگھ اور راجہ منوہر سنگھ کچھواہا بھی تھے، اس مہم میں بیس ہزار سوار تھے، راجپوت سرداروں کی نگرانی میں زیادہ تر راجپوت سوار تھے، رانا امر سنگھ اس لشکر جرار کی تاب نہ لا سکا، تو اپنے لڑکے باگھ سنگھ کو صلح کے لیے بھیجا، لیکن یہ صلح رانا امر سنگھ کے معاندانہ رویے کی وجہ سے زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکی، اور جہانگیر کو اپنے تیسرے سال جلوس میں مہابت خاں کی نگرانی میں پھر ایک فوج بھیجنی پڑی، جس میں توپچیوں، ہاتھیوں، احدیوں کے علاوہ بیس ہزار مسلح سوار بھی تھے، جن راجپوت سرداروں نے راجپوت فوجیوں کے ساتھ اس مہم میں شرکت کی، ان کے نام یہ ہیں: راجہ نرسنگھ دیو، نراین داس کچھواہا، اور راجہ کشن سنگھ راٹھور، موخر الذکر نے

[1] تزک جہانگیری ص ۲۰-۲۱ [2] ایضاً ص ۴، پر رانا ساگر کے بجائے رانا شنکر لکھا ہے، اور اس کو رانا امر سنگھ کا چچا زاد بھائی بتایا گیا ہے، لیکن موجودہ تحقیق سے اس کو امر سنگھ کا چچا رانا ساگر ہی کہا گیا ہے۔

اس معرکہ میں اپنی شجاعت اور بہادری کے اعلیٰ جوہر دکھائے، وہ دلیرانہ طور پر دشمنوں پر ٹوٹ پڑا، اور مردانہ وار لڑ کر رانا کے بتیس سرداروں کو تہ تیغ کیا، اور تین ہزار راجپوت سواروں اور سرداروں کو قید کر کے لایا، جہانگیر نے اس کی بہادری سے خوش ہو کر اس کو منصب دو ہزاری ذات ہزار سوار عطا کی،[1] اور رفتہ رفتہ وہ منصب سہ ہزاری ذات ہزار و پانصد سوار تک ترقی کر گیا، رانا امر سنگھ اپنے باپ رانا پرتاب سنگھ کی طرح پہاڑی درّوں اور وادیوں میں چھپ چھپ کر شاہی فوج کا مقابلہ کرتا رہا، اس لیے جب مہابت خاں کو اس کے لشکر کی سرکوبی میں تاخیر ہوئی تو جہانگیر نے اس کو واپس بلوا کر اپنے ایک دوسرے جری اور بہادر سوار عبد اللہ خاں کو وہاں بھیجا،[2] عبد اللہ نے اس مہم میں اپنی بہادری کا ایسا سکہ جمایا کہ جہانگیر نے اس کو پنجہزاری منصب کے علاوہ فیروز جنگ کا خطاب دیا، عبد اللہ خاں نے رانا امر سنگھ کا عرصۂ حیات تنگ کر دیا، اور اس کے اکثر و بیشتر نامی راجپوت سردار عبد اللہ کی یورش سے مارے گئے، جن میں سے خاص خاص کے نام یہ ہیں، نراین داس، سورج مل سسودیہ، ہرجی داس راٹھور، بھوپت جھالا کبیر داس کچھواہا، کیشو داس چوہان وغیرہ، عبد اللہ رانا کی مہم کو ابھی ختم نہ کر سکا تھا کہ وہ گجرات بھیجا گیا، اس کے بعد مہم کی کمان راجہ باسو کو دی گئی، لیکن رانا امر سنگھ کی پسپائی شہزادہ خرم کے ہاتھوں لکھی تھی، جہانگیری فوج کی پیہم اور متواتر یلغار و یورش کی وہ تاب نہ لا سکا، اور آٹھ نو سال کی تخریبی سرگرمیوں کے بعد سپر ڈال دی، اور جہانگیر کے اقتدار اعلیٰ کو قبول کر کے اس کا باجگذار بن گیا، اس کی پسپائی کی خوشخبری جن دو پیامبروں نے جہانگیر تک پہنچائی، ان میں ایک سندر داس بھی تھا، جو بعد میں رائے رایان کے خطاب سے سرفراز ہوا، رانا امر سنگھ پہلے تو شہزادہ خرم سے آ کر ملا، اور سر تسلیم خم کر کے دربار کے آداب کے مطابق سجدہ کیا، پھر اپنے لڑکے رانا کرن سنگھ کو جہانگیر کے پاس اجمیر بھیجا، رانا کرن سنگھ دربار میں آتے ہی سجدہ بجا لایا، اور جہانگیر کے اشارہ سے دست راست کے امراء کی صف میں کھڑا ہوا، جہانگیر

[1] تزک جہانگیری ص ۷۳-۷۱ [2] ایضاً ص ۷۷ [3] ایضاً ص ۱۳۵

کا دل راجپوتوں کی محبت و الفت میں ہمیشہ سرشار رہتا تھا، اسلیے رانا کے خاندان والوں نے اس کی حکومت کے خلاف مخاصمت اور دشمنی کی جو آگ ایک عرصہ تک بھڑکا رکھی تھی، اس کو بالکل بھول گیا، اور رانا کرن کی دلداری اور خاطرداری میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا، خود لکھتا ہے،

"کرن کی طبیعت میں وحشت تھی، مجلسوں کا عادی نہ تھا، پہاڑوں میں زندگی بسر ہوئی اس کو رام کرنے کے لیے میں نے روزانہ نئی نئی عنایتوں سے نوازا، دوسرے دن خنجر مرصع تیسرے دن زین مرصع کے ساتھ عراقی گھوڑا اپنی طرف سے بھیجا، اور پھر دربار جاکر نور جہاں بیگم کی طرف سے خلعت ذخرہ، شمشیر مرصع، اسپ بازین اور ہاتھی مرحمت کیا، اس کے بعد نہایت قیمتی مروارید کی تسبیح عطا کی، اس کے دوسرے دن ایک ہاتھی بھیجا، میرے دل میں یہ بات تھی کہ اسکو ہر قسم کی چیزیں دیجائیں، اس لیے تین باز، تین جرے، ایک قبضہ شمشیر، ایک بکتر، ایک جوشن اور دو انگوٹھیاں بھی بھیجیں، جن میں سے ایک میں لعل کا اور دوسری میں زمرد کا نگینہ تھا، اور اخیر مہینہ میں ہر قسم کے کپڑے، ہر قسم کی خوشبوئیں، طرح طرح کے طلائی ظروف سو خوانوں میں چن کر احدیوں کے کندھوں پر دیوان خاص و عام میں منگوائے، اور سب کرن کو عطا کیے......"[1]

ان ہی الطاف و اکرام کی بنا پر تمام راجپوت سردار تیموری سلاطین کے طلسم محبت میں گرفتار ہو کر ان کے جاں نثار بن گئے تھے، اور ان کی خاطر سر بکف ہو کر میدان جنگ میں لڑتے تھے،

شاہ جہاں نے راجپوتوں کے دلوں کو جس طرح تسخیر کیا، وہ اکبر و جہانگیر ہی کی روایت کے مطابق تھا، اس نے راجپوتوں سے رشتے تو قائم نہیں کیے، لیکن ان کی دلجوئی میں کسی قسم کی کمی نہیں کی، اس کے دربار اور فوج میں حسب ذیل بڑے ہندو سردار اور امراء تھے:

[1] تزک جہانگیری ص ۱۳۰

(۱) راجہ جسونت سنگھ پنجہزاری پنج ہزار سوار دو ہزار و پانصد سوار دو اسپہ سہ اسپہ (۲) راجہ جے سنگھ پنجہزاری پنجہزار سوار دو ہزار سوار دو اسپہ سہ اسپہ (۳) راجہ جگسنگھ پنجہزاری پنجہزار سوار (۴) راجہ جگت سنگھ پنجہزاری پنجہزار سوار (۵) راجہ بیٹھل داس گوڑ پنجہزاری پنج ہزار سوار (۶) مالوجی دکنی پنجہزاری پنجہزار سوار (۷) راؤ امر سنگھ چار ہزاری سہ ہزاری سوار (۸) راجہ رائے سنگھ سیسودیہ چار ہزاری دو ہزار سوار (۹) راجہ پہاڑ سنگھ بندیلہ سہ ہزاری سہ ہزار سوار دو ہزار سوار دو اسپہ سہ اسپہ (۱۰) راؤ ستر سال ہاڈا سہ ہزاری سہ ہزار سوار (۱۱) مادھو سنگھ ہاڈا سہ ہزاری سہ ہزار سوار (۱۲) مہیش داس راٹھور سہ ہزاری دو ہزار سوار و پانصد سوار (۱۳) نظر بہادر خویشگی سہ ہزاری دو ہزار و پانصد سوار (۱۴) راجہ جگت سنگھ سہ ہزاری دو ہزار سوار (۱۵) اودا جی رام دکنی سہ ہزاری دو ہزار سوار (۱۶) پرسوجی بھونسلہ سہ ہزاری و پانصد سوار (۱۷) جادون رائے دکنی سہ ہزاری و ہزار و پانصد سوار (۱۸) منکوجی نبالکر سہ ہزاری ہزار و پانصد سوار (۱۹) راجہ دیبی سنگھ بندیلہ دو ہزار و پانصدی (۲۰) راجہ راج روپ دو ہزاری دو ہزار سوار (۲۱) روپ سنگھ راٹھور (۲۲) رام سنگھ راٹھور (۲۳) سبل سنگھ دو ہزاری ہزار و پانصد سوار (۲۴) رائے ٹوڈرمل ہزار و پانصدی ہزار و پانصد سوار (۲۵) رتن راٹھور ہزار و پانصدی ہزار و پانصد سوار وغیرہ وغیرہ۔[1]

یہ راجپوت فوجی سردار اپنے منصب کے مطابق راجپوت سوار فراہم کرتے، جو ہر چھوٹی بڑی لڑائی میں بڑے فخر و غرور کے ساتھ شریک ہوتے، بلخ، بدخشاں اور ایران جو فوجیں بھیجی گئیں، ان میں مسلمان فوجی سرداروں کے ساتھ راجپوت سردار مثلاً راجہ جسونت سنگھ، راجہ دیبی سنگھ، راجہ جے سنگھ، راجہ راج روپ، راجہ پہاڑ سنگھ، وبیٹھل داس، راؤ ستر سال ہاڈا وغیرہ تھے، پورا لشکر سیکولر طریقہ پر مرتب کیا گیا تھا، جہاں مسلمان فوجی امراء اپنے مسلمان سپاہیوں کے ساتھ

[1] بادشاہ نامہ ج ۲ ص ۷۵۲ - ۷۱۷

کوچ کرکے آگے بڑھتے تھے، وہاں راجپوت سردار اپنے راجپوت سواروں اور لشکریوں کو لے کر ہندوستانی پرچم لہراتے، گھوڑوں کو بل کھلاتے اور اینڈتے ہوئے اپنے مسلمان بھائیوں کے دوش بدوش دشوار گذار راستے طے کرتے چلے جاتے تھے، ایسا بھی ہوتا کہ مسلمان فوجی امراء کی نگرانی میں راجپوت سوار ہوتے، اور راجپوت سرداروں کی نگہبانی میں مسلمان سوار ہوتے، اور یہ مغل سلاطین کے عمل تسخیر کا نتیجہ تھا،

راجپوتوں کی پوری تاریخ ان کے باہمی جنگ وجدل سے بھری ہوئی ہے، ایک راجپوت راجہ دوسرے راجپوت راجہ کی نگرانی یا قیادت میں لڑنا کسر شان سمجھتا تھا، چنانچہ بندی کے راجہ نے اکبر کے سامنے ہتھیار ڈالا تو اکبر سے اس کی منجملہ درخواستوں میں ایک یہ بھی تھی کہ کسی ہندو راجہ کی رہنمائی میں اس سے کوئی فوجی خدمت نہ لی جائے، لیکن مغل حکمرانوں نے اپنی رواداری، دوستی اور مآل اندیشی سے راجپوتوں کا بکھرا ہوا شیرازہ جوڑا اور انمیں یکجہتی، یکسانیت اور یگانگت پیدا کی، اور جب ان کو متحد کرکے اپنی فوج کا ضروری حصہ بنالیا تو ان راجپوتوں نے بھی ان کی فوج کی ترتیب و تنظیم کو بڑی رغبت سے اختیار کیا، خود جدوناتھ سرکار کا بیان ہے کہ ہندوؤں کو جنگ میں ہاتھیوں پر بڑا بھروسہ تھا، لیکن مسلمانوں نے سواروں کے دستے کے طریقۂ جنگ کو ہندوستان میں بڑی ترقی دی[1]، راجپوت سواروں نے اس ترقی سے پورا فائدہ اٹھایا اور وہ رفتہ رفتہ مغل بادشاہوں کے لشکر اور دربار میں اسقدر چھاگئے کہ شاہجہاں کے آخری دور میں ان ہی کا غلبہ اور استیلا نظر آتا تھا،

(باقی)

---

[1] اسلام ان انڈیا، از جدوناتھ سرکار

رامپور کا اسکول شاعری

از جناب کلب علی خاں فائق رامپوری

۱۱۱۸ھ میں اورنگ زیب کا انتقال ہوا، اور مغلیہ حکومت کا شیرازہ درہم برہم ہوگیا، صوبے خود مختار ہونے لگے، امراء پر بادشاہ کا اقتدار نہ رہا، جب شاہی خاندان میں بھائی بھائی سے دست و گریباں ہوں تو امراء کیوں نہ جھگڑتے، ہر ایک عروج کا متلاشی تھا، بہادر شاہ نے بھائیوں کو کھو کر سلطنت پائی لیکن کمزور ہاتھ سلطنت کی باگ ڈور سنبھالنے کی اہلیت نہ رکھتے تھے سکھوں نے فوجی حیثیت اختیار کرلی، صوبۂ لاہور و کشمیر مرکز سے دور ہونے کے باعث پامال ہوتا رہا، اور بادشاہ دیکھتے رہے، راجپوتانہ کے راجاؤں نے بھی اس کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اطاعت سے انحراف کیا لیکن جوڑ توڑ سے کچھ دنوں اس گرتی ہوئی عمارت کو روکنے کی کوشش کی گئی، شیعہ سنی سوال پہلی بار مغلیہ حکومت میں اٹھا لیکن رائے عامہ کے انتشار اور بہادر شاہ کی کمزوری سے یہ مسئلہ بھی سرد پڑگیا، ۱۱۲۴ھ میں بہادر شاہ کا انتقال ہوگیا، اس کے بیٹوں میں جنگ ہوئی اور کامیابی جہاندار شاہ کو نصیب ہوئی، اس کا خاتمہ فرخ سیر کے ہاتھوں ہوا، مگر یہ سودا مہنگا پڑا، سادات بارہہ کو امور سلطنت میں کامل اقتدار سونپ دینا پڑا، فرخ سیر کی حیثیت شاہ شطرنج سے زیادہ نہ تھی، بالآخر فرخ سیر کو بھی جان دینی پڑی اور سادات بارہہ نے چند تبدیلیوں کے بعد محمد شاہ کو تخت نشین کیا، اس عہد میں محمد شاہ نے دیگر امراء کی مدد سے عبد اللہ خاں قطب الملک اور حسین علی خاں امیر الامراء کی قید سے نجات پاکر آزادی کی فضا میں سانس لی، اور داد عیش دل کھول کر دی، یہانتک کہ ۱۱۵۱ھ میں نادر شاہ کی فوجوں نے آدبایا، اور بغیر لڑے بھڑے عظیم ہند کی فوجوں نے صرف

امیر الامرا اور برہان الملک کی معمولی جھڑپ میں زخمی ہو کر ایرانی فوج کے سامنے ہتھیار ڈالدیے، نادرشاہ نے دہلی میں بقرعید ۳۰ ہزار ہندوستانیوں کے قتل عام سے منائی اور کروڑوں روپیہ لوٹ کر واپس گیا، ۱۱۶۱ھ میں محمد شاہ کا انتقال اس حالت میں ہوا کہ احمد شاہ ابدالی کی فوجیں لاہور میں مغلیہ فوجوں سے برسرپیکار تھیں، اس کشمکش کے دور میں ۱۱۱۸ھ میں داؤد خاں نے روہیل کھنڈ میں آکر جس کی لاٹھی اس کی بھینس والی مثل کو آزمایا اور اس میں کامیابی ہوئی، ۱۱۳۹ھ میں داؤد خاں کے مارے جانے پر نواب علی محمد خاں روہیلوں کے سردار قرار پائے، انھوں نے اپنی دانشمندی اور زوردستی سے شاہی خالصہ اور امرا کی جاگیروں پر قبضہ کر لیا، اور بالآخر ۱۱۵۸ھ میں محمد شاہ کو ابھار کر کم ہمت امرا نواب علی محمد خاں کے مقابل میں لائے، مگر جب مغلیہ فوجوں سے کچھ نہ ہو سکا تو محمد شاہ کو خلیفہ بنا کر علما سے فتویٰ شائع کرایا گیا کہ خلیفہ سے بغاوت حرام ہے، بھولے بھالے روہیلے جو تلوار کی کاٹ ہی جانتے تھے، اس حیلہ کی کاٹ نہ کر سکے، ایک بڑی جماعت لشکر سے الگ ہو گئی، آخر نواب علی محمد خاں کو ہار ماننا پڑی، اور محمد شاہ کے دربار میں حاضر ہو گئے، روہیلوں کو اس علاقہ سے نکال دیا گیا، کچھ دنوں کے بعد نواب علی محمد خاں کو سرہند کا فوجدار مقرر کیا گیا، وہاں ان کی دھاک بیٹھ گئی، سرکش علاقہ مطیع ہو گیا، ۱۱۶۱ھ میں احمد شاہ ابدالی کی آمد کی خبر مشہور ہوئی، بعض کہتے ہیں کہ حکومت دہلی نے انھیں احتیاطاً وہاں سے بلا لیا، مگر بعض کا بیان ہے کہ یہ خود حالات کا اندازہ کر کے سرہند سے روانہ ہو گئے، اور آندھی کی طرح کوچ کرتے ہوئے پورے سابقہ علاقہ پر قابض ہو گئے، وزیر، امیر الامرا، اور دوسرے امرا منہ دیکھتے رہ گئے، کچھ مدت بعد ۱۱۶۲ھ میں ان کا انتقال ہو گیا، ان کی حکومت موجودہ حدود کمشنری روہیل کھنڈ سے کچھ زائد تھی، ان کے بعد حافظ رحمت خاں نے نواب سعد اللہ خاں کو جو خورد سال تھے تخت پر بٹھایا، ۱۱۶۳ھ میں فرخ آباد والوں سے جنگ کرنی پڑی، نواب قائم خاں مع بھائیوں کے مارے گئے، اور فرخ آبادی فوج تباہ ہو گئی، نواب عبد اللہ خاں اور نواب فیض اللہ خاں اس وقت احمد شاہ ابدالی کے ساتھ تھے،

جنھیں وہ ۱۱۶۱ھ میں سرہند سے اپنے ساتھ افغانستان لیتا گیا تھا، ۱۱۶۵ھ میں یہ دونوں بھائی ہندوستان آئے، اور یہاں ملک کا بٹوارہ ہوا، ۱۱۶۷ھ میں نواب فیض اللہ خاں کے حصے میں ضلع رامپور اور ضلع بریلی کا کچھ حصہ آیا، ۱۱۸۸ھ میں حافظ رحمت خاں اور نواب شجاع الدولہ والی اودھ کے درمیان جنگ ہوئی، حافظ رحمت خاں شہید ہوئے، اور نواب فیض اللہ خاں شکست خوردہ فوج کو ساتھ لے کر لال ڈانگ چلے گئے، رجب ۱۱۸۸ھ میں اس پر مصالحت ہوئی کہ مزید علاقہ مراد آباد شامل کر کے نواب فیض اللہ خاں کو دیدیا گیا، بقیہ تمام چھوٹی چھوٹی ریاستیں ضبط ہو گئیں، اب نواب فیض اللہ خاں کو امن و سکون ملا، انھوں نے شاہ آباد کی سکونت جو غالباً ۱۱۶۱ھ سے تھی، ترک کر دی اور رامپور کو پایۂ تخت قرار دیا،

روہیلوں کا جو گروہ نواب صاحب کے ساتھ تھا، یا تو وہ تھا جو عالمگیر کے انتقال کے بعد ہی داؤد خاں کے ساتھ ہو گیا تھا، یا ان کی اولاد اور ان کے خاندانی لوگ تھے، رام پور میں قبیلہ وار آبادی قائم ہوئی اور ہر سردار کے نام سے محلے موسوم ہوئے، مقامی لوگوں میں وہ ارباب علم و ہنر تھے، جو ریاست و امارت کو دیکھ کر ان کے ساتھ ہو گئے تھے، دہلی میں جو انقلاب آ رہا تھا، اس سے سبھی متاثر تھے، احمد شاہ ابدالی کے حملہ ۱۱۷۰ھ میں دلی کی جو تباہی ہوئی، اس سے دہلی کے تمام طبقات متاثر تھے، راجہ جوگل کشور کے پسر سورج مل جاٹ والی بھرت پور کے یہاں جا بسے تھے، دہلی کی بہت بڑی آبادی ان ہی جیسے امرا کے ساتھ بھرت پور میں مقیم ہو گئی تھی، کچھ اودھ کی نوزائیدہ حکومت کے دامن میں پناہ لے چکے تھے، اشرف علیخاں فغاں، سراج الدین علی خاں اس سے کچھ قبل فیض آباد پہنچ چکے تھے، غرض کوئی ڈھاکہ گیا کوئی پٹنہ، کوئی فرخ آباد اور بنارس، کچھ روہیل کھنڈ میں آ رہے، فارسی کا مذاق پھیکا پڑ گیا تھا اور اس کی جگہ اردو نے حاصل کر لی تھی، مقامی اصحاب بہ تغیر لہجہ اردو یا ہندوستانی سے کچھ نہ کچھ واقفیت رکھتے تھے، مگر روہیلوں کی مادری زبان پشتو اور ان کی معاشرت افغانی تھی، مگر یو پی کی آب و ہوا نے ان کے عادات میں حیرت انگیز تبدیلی کر دی، اور انھوں نے غارت گری چھوڑ کر جہاں بانی اور حکمرانی کے اصول اس طرح برت کر دکھائے کہ

انگریز مورخین بھی داد دیے بغیر نہ رہ سکے، ان کی اولاد نے یک لخت پشتو ترک کر دی اور اردو ہی کو اپنی زبان قرار دیا، چنانچہ نواب عنایت خاں اور نواب محبت خاں محبت وغیرہ ابنائے حافظ رحمت خاں اردو کے شاعر تھے، جرأت نواب محبت خاں کے دربار سے وابستہ رہ چکے ہیں، نواب محمد یار خاں امیر اور حکیم کبیر علی کبیر (انصاری) نے ۱۱۸۴ھ میں سودا اور میر سوز کو فرخ آباد سے نواب کی استادی کے سلسلہ میں طلب کرایا، لیکن فرخ آباد کی وسیع ریاست کی شان و شوکت ان دونوں کی نظروں میں ایسی بھا گئی تھی کہ انھوں نے آنے سے انکار کر دیا، شیخ محمد قائم قائم جو قصبہ چاند پور ضلع بجنور کے باشندے تھے، دہلی کے انقلاب سے متاثر ہو کر بسولی آکر مقیم ہو چکے تھے، وہ ٹانڈہ (ضلع بدایوں) آگئے، اس صحبت میں تو شاعر جمع تھے، جن کا مرقع نواب نے اپنے درباری مصور سے بنوایا تھا، جو نایاب ہے، مصحفی بھی اس صحبت میں شامل تھے، نجیب آباد پر مرہٹوں کا حملہ شاہ عالم ثانی کی سرپرستی میں ہوا تھا، اس حملہ سے روہیل کھنڈ بھی متاثر ہوا، مصحفی اودھ چلے گئے، محمد نعیم نعیم کا انتقال روہیل کھنڈ ہی میں ہو گیا، قدسی لاہوری کا بھی اسی سال انتقال مراد آباد میں آکر ہو گیا، اس طرح محمد یار خاں کو امن و اطمینان سے بیٹھنے کا موقع نہ مل سکا، اس لیے حافظ رحمت خاں کی شکست کے بعد وہ مع مصاحبین رام پور چلے گئے، اور یہیں ۱۱۸۸ھ میں ان کا انتقال ہوا، محلہ مدرسہ کہنہ میں ان کا مقبرہ ہے، وہ پہلا شاعر ہے جس نے رام پور کی زمین میں آرام کیا،

قائم جو سودا اور میر درد کے شاگرد ہیں، رام پور ہی رہے اور کبھی نواب احمد یار خاں سے متوسل ہوئے کبھی نواب نصیر اللہ خاں سے، اور آخر ۱۲۰۸ھ میں رام پور ہی میں انتقال کیا اور اپنے شاگرد امیر کے قریب دفن ہوئے، یہ قائم وہی ہیں جن کے حلقۂ ارادت میں شعراء کا بہت بڑا گروہ داخل ہے، میر محمدی مائل ان کے شاگرد تھے، ان سے شاہ نصیر کو شرف تلمذ حاصل ہوا، شاہ نصیر کے سلسلہ میں ذوق، مومن و حیا وغیرہ تھے، رام پور میں ان کے شاگردوں میں نواب محمد یار خاں امیر

کے علاوہ عباس خاں عباس، عنبر شاہ خاں آشفتہ، احمد یار خاں افسر اور مولوی قدرت اللہ شوق ہیں۔

مولوی قدرت اللہ شوق علوم معقول و منقول میں مولوی غلام طیب بہاری کے شاگرد ملا کمال الدین اور مولوی وہاج الدین گوپاموی کے شاگرد تھے، ان کی تصانیف میں تذکرہ شعرائے اردو طبقات الشعراء (۱۱۸۸ھ)، جام جہاں نما (۱۱۹۹ھ) اور تکملۃ الشعراء (۱۲۰۹ھ تذکرہ شعرائے فارسی) ہیں، اگرچہ انھوں نے طبقات الشعراء میں اپنی شاگردی کا اظہار نہیں کیا ہے، لیکن صاحب مجموعۂ نغز نے ان کی حیات میں ان کو قائم کا شاگرد لکھا ہے، شوق کے سلسلہ میں حسب ذیل شاعر داخل ہیں:

(۱) عزیز خاں بے جان	ولادت	۱۱۶۱ھ	وفات	
(۲) احمد خاں احمد	〃	۱۱۹۶ھ	〃	۱۲۲۱ھ
(۳) غلام محمد خاں ماہر	〃	۱۲۰۳ھ	〃	۱۲۲۵ھ
(۴) کریم اللہ خاں کریم	〃	۱۱۸۲ھ	〃	۱۲۵۳ھ
(۵) حافظ الہ داد عرف شبراتی طالب	〃	۱۱۸۵ھ	〃	۱۲۷۵ھ
(۶) میر محب علی مفلس	〃	۱۱۵۱ھ	〃	۱۲۲۳ھ
(۷) کریم الدین صنعت	〃	۱۱۹۰ھ	〃	۱۲۶۵ھ
(۸) مولوی غلام قادر مسکین	〃	۱۱۴۱ھ	〃	۱۲۱۹ھ
(۹) مولوی غلام جیلانی رفعت و بیدم	〃	۱۱۴۸ھ	〃	۱۲۳۴ھ
(۱۰) محمد معظم عباسی	〃	۱۱۶۸ھ	〃	۱۲۰۹ھ
(۱۱) مولوی شیخ غلام علی حرفت	〃	۱۱۹۷ھ	〃	۱۲۴۴ھ
(۱۲) ناصر خاں ناصر	〃	۱۱۹۹ھ	〃	۱۲۵۹ھ
(۱۳) مستقیم خاں وسعت	〃	۱۱۷۸ھ	〃	۱۲۴۶ھ

(۱۴) اخوندزادہ احمد خاں غفلت ولادت ۱۱۹۵ھ وفات ۱۲۵۹ھ

(۱۵) حکیم احمد خاں فاخر " ۱۱۹۸ھ " ۱۲۹۰ھ

(۱۶) محمد بلاقی خاکسار

قائم کے علاوہ ایک دوسرا سلسلہ بھی رامپور میں پایا جاتا ہے، جو جعفر علی حسرت کے شاگردوں جرأت و محبت سے جاری ہوا،

جرأت کے شاگرد شاہ رؤف احمد رافت (۱۲۴۹ھ) اور رافت کے شاگرد اور داماد حافظ اکرم الدین ضیغم تھے جو بنگال میں مقیم ہوگئے تھے، ان کے شاگرد مولوی رشید النبی وحشت اور ان کے شاگرد مولوی عبدالغفور خاں نساخ تھے جن سے بنگال میں اردو شاعری کا رواج ہوا، اسی سلسلہ کو آج سید رضا علی وحشت کلکتوی بنگال میں زندہ کیے ہوئے ہیں۔

نواب محبت خاں محبت کے شاگرد حکیم میر ضیاء الدین عبرت (صاحب مثنوی پدماوت) تھے، ان کے بیٹے سید رفیع الدرجات نزہت باپ کے شاگرد بھی تھے، نزہت کے شاگرد سید جمال شاہ مظلوم اور سید منصور علی منصور وعلی تھے، جو صوفیانہ شاعری میں اضافہ کررہے تھے،

مصحفی کے سلسلہ میں نام بنام چند اشخاص داخل ہیں، مثلاً رافت نے لکھنؤ پہنچ کر ان کو کلام دکھایا، اور بقول جرأت مصحفی کے شاگرد ہوگئے، نواب فصیح اللہ خاں مفتوں خلف نواب نصراللہ خاں لکھنؤ گئے، اور غفلت کی ہدایت کے مطابق مصحفی سے اصلاح حاصل کی (۱۲۳۰ھ تا ۱۲۳۴ھ) حکیم صغیر علی مروت خلف حکیم کبیر علی انصاری کبیر نجو خاں صاحب کے ملازم تھے، انھوں نے ابتدا میں میر حسن سے اصلاح لی اور پھر جرأت سے، لیکن کسی کی شاگردی کے مقر نہ تھے، مثنوی میر حسن کے جواب میں مثنوی لکھی تھی، اور میر حسن کو دکھانا چاہتے تھے کہ انتقال ہوگیا (۱۲۰۱ھ)

میر غلام علی عشرت سودا کے شاگرد دلطف سے تلمذ رکھتے تھے (انھوں نے ۱۲۱۱ھ میں

میر ضیاء الدین عبرت کی ناتمام مثنوی پدماوت کو پورا کیا،

حکیم عطاء اللہ غمگین و انتظار، حافظ عبدالحبیب شیفتہ (۱۲۱۹ھ) شیخ الاسلام اوہم حکیم صدرالدین آزردہ دہلوی اخوندزادہ ہمت خاں ہمت، نواب نصراللہ خاں سلطان وغیرہ کسی سلسلہ میں منسلک نظر نہیں آتے، یہ سب باہم مل کر داد سخن دیتے، حکیم صدرالدین خاں دہلوی غالباً ۱۲۰۳ھ اور ۱۲۰۴ھ میں اپنے مکان پر بزم مشاعرہ منعقد کرتے تھے، ۱۲ جمادی الثانی ۱۲۰۳ھ کو پہلا مشاعرہ ہوا، اس طرح ماہ قمری کی ۱۲ تاریخ کو برابر مشاعرہ منعقد ہوتا رہا، ۱۲۱۱ھ میں مولوی قدرت اللہ شوق کے مکان پر بعد نماز جمعہ ہر ہفتہ مشاعرہ منعقد ہوتا تھا،

اگرچہ اردو شاعری کا انحطاط ۱۱۹۱ھ سے شروع ہوچکا تھا، کہاں سراج الدین علی خاں آرزو اور مرزا مظہر جانِ جاں کی رہنمائی اور کہاں ان کے متبعین کی قیادت، اسی لیے نہ کوئی ثانی میر بن سکا، نہ سودا و میر درد، نہ سوز کا رنگ پیدا کرسکا، نہ قائم کا لہجہ، اودھ میں جاکر جب پورب اور پچھم کا مقابلہ ہوا تو وقتی طور پر پچھم کو میدان چھوڑنا پڑا، سودا اور میر کی قیادت کسی نے تسلیم نہیں کی، اور وہاں حسرت و جرأت کا سہل سلیس اور شگفتہ طرز بیان پسند کیا گیا، مصحفی نے تہذیب و متانت کا دامن تھامنے کی کوشش کی، لیکن ان کی کوشش بھی رائگاں گئی، میر ایک شعر پر دو تکیہ پھولے نہ سمائے، جرأت اس سے بھی محروم رہے، انشاء نے اس چھوٹی تہذیب و متانت کو خیرباد کہہ اور رنگینی کو ابھار کر ایک نئی طرز ریختہ میں ریختی نکالی، مصحفی کی رسوائی میں دقیقہ نہ اٹھا رکھا، اور جب اس میدان میں بھی تنگی پائی تو دریائے لطافت لکھ کر لکھنؤ اسکول کی شاعری کا سامان نوجوان شعرا کے لیے مہیا کیا، اور دہلی قابل سند نہ رہا،

چنانچہ ناسخ نے شاعری میں محبوب کے داخلی اوصاف صنائع بدائع اور بلند معانی کو داخل کرکے مذاق شاعری بگاڑ دیا اور دہلی سے بغاوت کی جو تحریک انشاء نے پھیلائی تھی اس پر پورا پورا

عمل کیا گیا، اور تہذیب و معاشرت میں ہر وہ سکہ مسترد کر دیا گیا جس کا تعلق دہلی سے تھا،

دہلی کی حکومت قلعہ معلیٰ کی چار دیواری میں محدود ہو کر رہ گئی تھی، اودھ کے حدود ریاست کافی وسیع اور اس کے ذرائع آمدنی لامحدود تھے، اس بنا پر اردو شاعری میں لکھنوی مذاق سخن رائج ہونے لگا، گو مصحفی کے ہاتھوں کچھ نہ کچھ مذاق سخن قائم رہا، مگر ان کے شاگرد اسکو باقی نہ رکھ سکے، دہلی کی بگڑی ہوئی حالت بھی لکھنو کے سو سنگھاروں سے بہتر تھی، قائم چاند پوری مولد اور رامپوری مسکن و مدفن (۱۲۰۸ھ) کے شاگرد میر قمر الدین منت تھے، ان کے بیٹے میر نظام الدین ممنون (متوفی ۱۲۰۶ھ) نے جو منت ہی کے شاگرد تھے، شاعری میں ایک نئی طرز ایجاد کی جس میں تخیل کی انتہائی بلند پروازی کے ساتھ سوز و گداز اور سلاست و شگفتگی بھی کمال درجہ کی تھی، عوام اگرچہ اس رنگ کے مداح نہ تھے لیکن خواص نے اس کو پسند کیا، مفتی صدر الدین آزردہ ان ہی ممنون کے شاگرد رشید تھے، آزردہ کی محفل علما و ادبا و شعرا سے معمور رہتی تھی، شیفتہ و مومن و غالب ان کے دوست اور ہم صحبت تھے، شاہ نصیر کے بگڑے ہوئے مذاق سخن کو ان لوگوں نے سنبھالا، قلعہ معلیٰ میں حافظ عبد الرحمن احسان چھائے ہوئے تھے، ذوق اور مومن نے شاہ نصیر سے تلمذ حاصل کیا، لیکن انکا رنگ نہ پا سکے، غالب، آزردہ، مومن و شیفتہ و ذوق وغیرہ نے گرتے ہوئے مذاق سخن کو بلند کیا اور دہلی کا نام باقی رکھا، اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ جس شمع کا اجالا دہلی میں تھا یعنی سلسلہ قائم وہی شمع رامپور میں روشن ہوئی مولوی قدرت اللہ شوق کا کلام ضائع ہو گیا، البتہ ان کے شاگردوں کے بیشتر دیوان سرکاری کتاب خانے میں محفوظ ہیں،

رامپور چھوٹی سی ریاست رہ گئی تھی، اس لیے اس کی آواز اپنی چار دیواری میں محدود تھی، اودھ کے جاہ و جلال اور دہلی کے باقی ماندہ اثرات کے سامنے رامپور کی آواز کون سنتا سوائے انکے جن کو تعلق تھا، اس طرح رامپور کی شاعری نے مقامی خصوصیات اور دہلی کے اتباع کا لحاظ کرتے ہوئے ایک علیحدہ طرز سخن پیدا کیا، جو مقامی فضا میں چھایا رہا، لیکن باہر اس کا اثر محسوس نہیں کیا گیا،

لیکن نواب محمد سعید خاں کے عہد (۱۲۵۶ھ تا مارچ ۱۲۶۵ھ) سے جب بیرونی ارباب علم یہاں بسلسلہ تحصیل معاش آئے تو اس رنگ شاعری سے متاثر ہوئے، اور اپنا رنگ تبدیل کیا،

اب ہم شوق اور ان کے چند شاگردوں کے چند اشعار درج کرتے ہیں، جن سے رامپوری اسکول شاعری کو سمجھنے میں مدد ملے گی،

شوق ۱۲۲۳ھ	دین و دل صبر و قرار و خرد و تاب و تواں	گھر کا گھر لٹ گیا اور ہم سے بچایا نہ گیا
	اے خدا یوں بھی کبھی تیری خدائی ہو گی	کہ مجھے اس کی جدائی سے جدائی ہو گی
	کیا دل کا فرماجرا دو دیر و کعبہ ہے	نے بتوں سے ربط اسکو نے خدا سے آشنا
	کیا عشق ہی ہوتا ہے الٰہی مرض الموت	جس رنج کو سنتے ہیں نہ دارو نہ دوا کا
	مغفرت ہاتھ باندھ کر آئی	دیکھ میرے گناہ کی قسمت
غفلت ۱۲۵۹ھ	ہم تو کعبہ کے تئیں سمجھے تھے خانہ اس کا	پر جو دیکھا تو ہر اک جا ہے ٹھکانا اس کا
	لو ہو کے چند قطرے پھر آنکھوں میں آ گئے	سمجھا تھا میں کہ زخم مرے دل کا بھر چلا
	صیاد کب وہ طائر زیرک اسیر ہو	جو آشیاں کو دام سمجھ پر فشاں رہا
	وہ چشم و لب نظر آئے ہیں جب سے اپنے تئیں	نہ ہوش مرگ رہا ہے نہ زندگی کی خبر
	اہل دنیا کی کہاں پروا کریں افتادہ گاں	گوش شاہاں تک بھلا کب گوہر شبنم گیا
	غفلت یہ ابتدائے محبت ہوئی تمام	آغاز کو بھی آہ وہ انجام کر چلے
	پار ہو جاتی ہے سینہ سے وہ برگشتہ مژہ	تو تو کم کرتا ہے ورنہ ہو کبھی جس تیر میں
کرم ۱۲۵۳ھ	مریض ناتواں آہیں جو بھرتا ہے تو بھرنے دو	کسی کے دل میں یہ راہیں جو کرتا ہو تو کرنے دو
	لکھتا ہوں خط اور پیہم اشکوں سے بھگوتا ہوں	دھو دھو کے میں لکھتا ہوں لکھ لکھ کے میں دھوتا ہوں
	وہ بھولی بھولی سی اسکی صورت بسی ہے آکر جو چشم تر میں	قلق گذرتا ہے دل پہ ہر دم، اٹھے ہیں جو کہیں مرے جگر میں

مرتے تو ہیں پر ایک نظر دیکھ لیں اسکو — اے زندگی ہم سے کوئی دم اور وفا کر

شب اسکے غم سے زیک جا میں تا سحر بیٹھا — درونِ خانہ کبھی گہ برونِ در بیٹھا

کم نصیبی نہ اسے کہیے تو پھر کیا کہیے — یار جب بر میں ہو اور طاقتِ گفتار نہ ہو

(غالب) بت خانہ و کعبہ ہمیں یکساں نظر آیا — جو یہاں نظر آیا وہی وہاں نظر آیا

گھر آنے کی بھی رخصت تھی اب نہیں ملتی — ستم یہ ہم پہ نیا آج مہرباں ہوا

کیا محفلِ شادی و غم و درد میں بیٹھوں — ہنسنا نہیں آتا مجھے رونا نہیں آتا

اے ہمصفیر کر نہ قفس میں چمن کی بات — جب بے وطن ہوئے تو سنیں کیا وطن کی بات

بیٹھے ہیں ہاتھ جھاڑ کے کون و مکاں سے ہم — کس بات کی ہوس کریں پھر آسماں سے ہم

دل لگایا تھا دل لگی کے لیے — ہم تو ناخوش ہوئے خوشی کیلیے

نفسِ عیسوی نہ کر ممنون — مجھکو دو دن کی زندگی کیلیے

تصانیف اشعری

از جناب عابد رضا خاں صاحب بیدار رام پوری

امام ابوالحسن اشعری کی تصانیف کی تعداد اتنی کثیر ہے کہ ان میں سے اکثر کتابوں کے نام تک نہیں معلوم ہیں، مگر مختلف کتابوں میں ان کی مختلف تصانیف کا ذکر ہے، اس مضمون میں ان سب کو یکجا کر دیا گیا ہے، اور اتنی کتابوں کا ذکر کسی ایک کتاب میں نہیں مل سکتا، بعض کتابوں کے موضوع کی بھی تصریح ہے، یا کم سے کم ان کے ناموں سے اس کا کسی قدر اندازہ ہو جاتا ہے جس سے امام ابوالحسن اشعری کے متکلمانہ خدمات کی وسعت، اہمیت اور اس کے تنوع و کثرت پر بھی روشنی پڑتی ہے، اس لیے اس کو شائع کیا جاتا ہے، مولانا محمد اویس نگرامی ندوی نے دسمبر ۱۹۴۳ء کے معارف میں امام ابوالحسن اشعری پر ایک مضمون لکھا تھا جس میں ان کی صرف چند تصانیف کا تذکرہ تھا، اس مضمون کو اس کا تکملہ سمجھنا چاہیے۔ (م)

مورخین نے امام ابوالحسن اشعری کی تصانیف کی تعداد تین سو تک لکھی ہے، ممکن ہے اسمیں کچھ مبالغہ ہو لیکن ان کے کثیر التصنیف ہونے میں کوئی شبہ نہیں، چنانچہ انھوں نے اپنی کتاب العمد میں اپنی سٹر تصانیف کے نام لکھے ہیں، جو انھوں نے ۳۲۰ھ تک لکھی تھیں، ابن عساکر اور ابن فورک نے ان کی جو فہرست لکھی ہے وہ خود کتاب العمد سے ماخوذ ہے، لیکن اس میں کچھ مزید نام بھی ہیں اور اس طریقہ سے ان کی ان تصانیف کی تعداد جن کے نام معلوم نہیں سو سے اوپر ہو جاتی ہے،

۱۹۵۳ء میں "الاشعری کی دینیات" کے نام سے کیتھولک مطبع سے رچرڈ جے مک کارتھی

کی کتاب انگریزی میں شائع ہوئی ہے، اس میں کتاب اللمع فی الرد علی اہل الزیغ والبدع اور رسالہ فی استحسان الخوض فی علم الکلام کا انگریزی ترجمہ مع عربی متن کے شامل ہے، اور چار ضمیمے انگریزی میں ہیں (۱) ترجمۂ اشعری از خطیب بغدادی (۲) خلاصۂ تبیین کذب المفتری فی ما نسب الی الامام ابوالحسن الاشعری (۳) فہرست تصانیف اشعری (۴) مقالات الاسلامیین اور ابانہ عن اصول الدیانہ"

کتاب اللمع کے علاوہ اس کتاب کا ہر حصہ شائع شدہ چیزوں کی نقل یا ترجمہ ہے، کتاب اللمع پہلی مرتبہ امریکی یونیورسٹی بیروت کے قلمی نسخہ کی مدد سے شائع کی گئی ہے، اشعریؒ کے مطالعہ کے لیے کتاب اللمع سے زیادہ اچھی کتاب اب تک منظر عام پر نہیں آئی، اس پر تفصیلی بحث ہمارے موضوع سے باہر ہے، اس لیے ضمیموں سے صرف اشعریؒ کی تصنیف کی فہرست نقل کیجاتی ہے، یہ فہرست اتنی مکمل شکل میں پہلی مرتبہ شائع ہوئی ہے، اس میں بیشتر کتابوں کے صرف نام معلوم ہیں، تاہم ان ناموں سے انکے علم کلام کی وسعت اور وسعت کا ہلکا سا اندازہ ہوجاتا ہے، یہی اس فہرست کی اہمیت ہے، یہ زیادہ تر ابن عساکر سے ماخوذ ہے، جسے ابن عساکر نے ابن فورک کی روایت سے بیان کیا ہے اور خود ابن فورک نے اشعریؒ کی کتاب العمد سے اخذ کیا ہے، العمد میں اشعریؒ نے اپنی ان تمام کتابوں کے نام دیے ہیں جو ۳۲۰ھ تک لکھی جا چکی تھیں، ابن فورک نے ان کتابوں کے نام بھی بڑھائے ہیں، جو ۳۲۰ھ اور ۳۲۴ھ یعنی امام اشعریؒ کے سال وفات تک تصنیف ہوئیں، اس کے علاوہ چند کتابوں کے نام دُرد وغیرہ مستشرقین کی تحقیق کا نتیجہ ہیں، کل تعداد ۱۰۶ تک پہنچتی ہے، جن میں مطبوعہ اور غیر مطبوعہ دونوں شامل ہیں:-

یہ فہرست اور اس کی تشریحات کتاب العمد سے ماخوذ ہیں، اس لیے یہ تشریحات خود امام ابوالحسن اشعریؒ کی ہیں،

(۱) "الفصول : ملاحدہ، فلاسفہ، مادیین، حلولیین اور ان لوگوں کی رد میں جو

عالم کو ازلی مانتے ہیں، اس میں یہود، مجوس، براہمنہ اور نصاریٰ کا بھی رد ہے، یہ ایک ضخیم کتاب ہے جس میں ۱۲ کتابیں ہیں، ان میں ابن راوندی کی کتاب التاج" کی تردید بھی شامل ہے،

(۲) کتاب الموجز :- ۱۲ حصوں میں ہے، آخری حصہ "کتاب الامامت" ہے جس میں حضرت ابوبکرؓ کی امامت کی حمایت اور "امام ناقرد" اور "ہر عہد میں ایک امام معصوم کے وجود" کے عقیدہ کی تردید کی گئی ہے،

(۳) کتاب فی خلق الاعمال :- معتزلہ اور قدریہ کے عقیدہ خلق اعمال کے رد میں۔

(۴) کتاب کبیر فی الاستطاعت : اس میں استطاعت کے بارہ میں معتزلہ کے دلائل رد کیے گئے ہیں۔

(۵) کتاب کبیر فی الصفات :- معتزلہ، جہمیہ اور دوسرے مخالفین کی رد میں ہے، علم، قدرا اور دوسری صفاتِ الٰہی کے سلسلے میں، ابوالہذیل، معمر، نظام اور فوطی کے رد میں، اور عالم کو ازلی ماننے والوں کے رد میں، اور اس بحث میں کہ خدا کا چہرہ ہے، اس کے ہاتھ ہیں، اور وہ کرسیِ عرش پر قائم ہے، لمعہ ناسی اور اس کے عقیدۂ اسماء وصفات کی تردید بھی اس میں شامل ہے۔

(۶) "کتاب فی الجواز رویت اللہ بالابصار :- اس میں معتزلہ کے انکار رویت کے تمام دلائل رد کیے ہیں،

(۷) "کتاب کبیر ذکرنا فیہ اختلاف الناس فی الاسماء والاحکام والعام والخاص گناہ کبیرہ کے مرتکب کے سلسلہ میں اسماء اور احکام

(۸) "کتاب فی الرد علی المجسمہ :- اس میں مجسمہ کا رد ہے۔

(۹) "کتاب اخر فی الجسم :- اس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ ہمارے مقابلہ میں معتزلہ جہمیہ کے سوالوں کے جوابات نہیں دے سکتے۔ اس میں یہ بھی ثابت کیا ہے کہ جہمیہ کے دلائل

معتزلہ کے اصولوں کے مقابلہ میں زیادہ قوی ہیں۔

(۱۰) کتاب ایضاح البرہان فی الرد علی اہل الزیغ والطغیان:— الموجز
کے تعارف کے طور پر۔

(۱۱) "کتاب لطیف سمیناہ" کتاب اللمع فی اہل الزیغ والبدع

(۱۲) اللمع الکبیر۔ (۱۳) اللمع الصغیر۔

(۱۴) کتاب الشرح والتفصیل فی الرد علی اہل الافک والتضلیل:
"کتاب اللمع" کے تعارف کے طور پر تمہیدی کتاب ہے۔

(۱۵) کتاب مختصر۔ (۱۶) کتاب کبیر: الاصول کے رد میں۔ محمد بن عبد الوہاب
الجبائی کے رد میں معتزلہ کے عقائد کے بیان اور اس کے رد میں، معتزلہ کے ہر اس مسئلہ کے رد میں
جس میں ہمارا ان کا اختلاف ہے۔

(۱۷) کتاب کبیر:- نقد تاویل الادلہ کے رد میں، بلخی کے رد میں معتزلہ کے اصول میں،

(۱۸) کتاب فی مقالات المسلمین: تمام اختلافات اور نظریات کے بیان میں (یہ کتاب غالباً
مقالات الاسلامیین ہی ہے)

(۱۹) کتاب جمل المقالات: ملاحدہ اور نام نہاد 'اہل التوحید' کے رد میں،

(۲۰) کتاب الجوابات فی الصفات عن مسائل اہل الزیغ والشبہات: یہ ایک
ضخیم کتاب ہے، جو ہم نے خود اپنی کتاب کے رد میں لکھی ہے، جو کبھی معتزلہ کی حمایت میں لکھی تھی، معتزلہ کی حمایت
میں ابتک ایسی کتاب نہیں لکھی گئی۔ مگر اب خدا نے ہمیں صحیح راستہ دکھایا اور ہمیں اسکی تردید کے قابل کیا،

(۲۱) کتاب علی ابن الراوندی: صفات اور قرآن کے موضوع پر،

(۲۲) ایک کتاب جس میں ہم نے خالدی کی اس کتاب کا رد کیا، جو اس نے قرآن اور صفات الٰہی

کے بارے میں لکھی ہے، یہ کتاب اس نے اپنی کتاب المختصر سے پہلے لکھی تھی،

(۲۳) القامع لکتاب الخالدی فی الارادۃ: خالدی کی کتاب کے رد میں جس میں
اس نے لکھا ہے کہ آغاز تو خدا کے ہاتھ میں ہے، مگر بہت سی چیزیں خدا کے ارادے کے خلاف ہوتی
ہیں اور اکثر نہیں ہوتیں۔

(۲۴) الدافع للمہذب: خالدی کی 'مہذب' کے رد میں،

(۲۵) خالدی کی ایک کتاب کے رد میں جس میں اس نے "رویت سعیدہ" سے انکار کیا ہے،

(۲۶) بلخی کی اس کتاب کے رد میں جس میں اس نے ابن راوندی کی غلطیاں دکھائی ہیں۔

(۲۷) خالدی کی اس کتاب کے رد میں جس میں اس نے اس سے انکار کیا ہے کہ ارادہ اور عمل خدا کی طرف سے ہیں،

(۲۸) کتاب الاستشہاد: جس میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ معتزلہ کے دلائل سے خدا کا علم،
قدرت اور دوسری صفات ثابت ہوتی ہیں۔

(۲۹) کتاب المختصر فی التوحید والقدر: کلام کے مختلف ابواب پر ہے، جس میں
رویت، صفات، ارادہ الٰہی کی ہمہ گیری، علت ثانی یا تولد اور خدا کی جانب عدل وجور کی نسبت کے
مباحث ہیں، اس کتاب میں ہم نے معتزلہ سے چند سوالات بھی کیے ہیں، جنکے جواب دینے سے وہ قاصر ہیں۔

(۳۰) کتاب فی شرح ادب الجدل۔ (۳۱) کتاب الطبریین (۳۲) جواب
الخراسانیہ (۳۳) کتاب الارجانیین (۳۴) جواب السیرافیین
(۳۵) جواب الرامانیین (۳۶) جواب الجرجانیین (۳۷) جواب الدمشقیین
(۳۸) جواب الواسطیین (۳۹) جواب الرامہرمزیین:- رامہرمز کے ایک معتزلی نے
چند سوالات مجھ سے کیے تھے، یہ ان کے جواب میں ہے۔ (۴۰) المسائل المنثورات البغدادیۃ:
وہ مناظرے جو ہمارے اور بڑے بڑے معتزلین کے درمیان ہوئے۔

(۴۱) "المنتحل فی المسائل المنثورات البصریات" (۴۲) کتاب اللغون: ملاحدہ کے رد میں۔ (۴۳) "کتاب النوادر فی دقائق الکلام: (۴۴) کتاب الادراک (۴۵) اسکافی کی "لطیف" کی تردید میں۔ (۴۶) عباد بن سلیمان کے کلام کے رد میں (۴۷) علی ابن عیسیٰ کی کتاب کے رد میں (۴۸) المختزن: کلام کے مختلف مسائل کے بارے میں اور مخالفین کے رد میں۔ (۴۹) شئ پر ایک کتاب۔ اس میں اس خیال کی تردید کی گئی ہے کہ اشیاء بہر حال اشیاء ہیں چاہے وہ معدوم ہوں۔ (۵۰) فی اجتہاد الاحکام۔

(۵۱) "فی ان القیاس یخص ظاہر القرآن"۔ (۵۲) "فی المعارف" (۵۳) "کتاب فی الاخبار وتخصیصها"۔ (۵۴) "کتاب اللغون"۔ مسائل کلام پر۔ (۵۵) "جواب المصریین" (۵۶) "کتاب المسائل علی اهل التثنیة" (۵۷) اس مسئلہ پر کہ کسی چیز کا کر سکنا، اس کے مقابل نہ کر سکنے سے بالکل الگ چیز ہے۔

(۵۸) "الاستقصاء لجامع اعتراض الدهریین وسائر اصناف الملحدین"۔ (۵۹) مادیین کے رد میں، جو اجسام کے قدم کے قائل ہیں۔ (۶۰) داؤد بن علی الاصبهانی کے رد میں، اعتقاد کے بعض مسائل کے رد میں (۶۱) "تفسیر القرآن والرد علی من خلق البیان من اهل الافک البرهان"۔ اس میں ہم نے جبائی اور بلخی کی وہ غلطیاں دکھائی ہیں جو ان سے قرآن کی تاویل میں ہوئیں، (۶۲) "زیادات النوادر"۔ (۶۳) "جوابات اہل فارس"۔ (۶۴) ان لوگوں کے رد میں جن کا قول ہے کہ مادہ بالطبع حرکت کرتا ہے۔

(۶۵) رویت سعیدہ پر: اس میں ہم نے جبائی کے اقوال کی تردید کی ہے جو محمد بن عمر الصیمری نے جمع کیے۔ (۶۶) "الجواهر فی الرد علی اهل الزیغ والمنکر"۔ (۶۷) جبائی کے سوالوں کے جواب میں (۶۸) ادب الجدل (۶۹) "کتاب فی الرد علی الفلاسفه"؛ اس میں

تین مقالے ہیں: ابن قیس منطقی کے رد میں، ہیولیٰ اور طبائع پر یقین رکھنے والوں کے رد میں اور ارسطو کے ان خیالات کے رد میں جو عالم اور افلاک سے متعلق ہیں۔

ابن فورک کے اضافے یعنی تصانیف ۳۲۰ھ تا ۳۲۴ھ

(۷۱) اسکافی کی کتاب المضاهات کے رد میں، قدر کے عقیدہ کے سلسلہ میں (۷۲) کتاب العمد فی الرویت۔ (۷۳) کتاب فی معلومات الله ومقدوراته۔ (۷۴) حارث الوراق کے رد میں، صفات الٰہی کے سلسلے میں، اور ابن راوندی کے رد میں، (۷۵) اہل تناسخ کی تردید میں (۷۶) ابو الہذیل کے رد میں، 'حرکت' کے سلسلے میں (۷۷) اہل منطق کے رد میں (۷۸) 'اسماء' اور 'احکام' پر چند سوالات جو جبائی سے کیے گئے (۷۹) 'خبر واحد' پر مناظرہ (۸۰) قیاس کے سلسلے میں (۸۱) "کتاب فی افعال النبیؐ (۸۲) کتاب فی الوقوف والعموم (۸۳) کتاب فی متشابه القرآن: اس میں اشعریؒ نے ملاحدہ اور معتزلہ کو ایک ہی [illegible] کر کے ان کا رد کیا ہے، اور ابن راوندی کی کتاب التاج کا بھی رد ہے۔ (۸۴) "عیسائیوں کے عقائد پر" (۸۵) "امامت پر" (۸۶) عیسائیوں کے رد میں، اس میں ان ہی کی ان کتابوں سے دلائل دیے گئے ہیں، جن کو وہ تسلیم کرتے ہیں، (۸۷) ابن راوندی کے رد میں، اس کے "تواتر" کی تردید کے رد میں (۸۸) مجسمہ کے عقائد اور دلائل پر" (۸۹) کتاب نقض شرح الکتاب (۹۰) ابو الفرج مالکی اور اشعریؒ کے درمیان علت الخمر پر مباحثہ (۹۱) ارسطو کی کتاب 'آثار العلویہ' کے رد میں۔ (۹۲) ابو ہاشم کے سوالات کے جواب میں۔ یہ کتاب ابی مالح الطبری کی درخواست پر لکھی گئی (۹۳) کتاب الاحتجاج (۹۴) کتاب الاخبار (۹۵) نبوت کی نشانیوں پر (۹۶) "امامت پر"

ابن عساکر کے اضافے

(۹۷) رسالة الحث البحث (۹۸) ایک رسالہ عقائد پر، اس بارے میں کہ

آیا "خلق" کا استعمال صحیح ہے (۹۹) سرحد کے آدمیوں سے کچھ سوال کیے گئے تھے، انکے جواب میں، اہل الحق کے عقائد کے سلسلے میں۔

ابن ندیم کی فہرست میں ایک مزید کتاب | (۱۰۰) "کتاب التبیین عن اصول الدین" (ہو سکتا ہے کہ یہ "ابانہ" ہو)

برٹر وغیرہ مستشرقین کے یہاں کچھ اور کتابوں کے حوالے ہیں جن میں بعض چھپ گئی ہیں:

(۱۰۱) رسالہ استحسان الخوض فی علم الکلام (مطبوعہ حیدرآباد ۱۳۲۳ھ و ۱۳۴۴ھ)

(۱۰۲) قول جملۃ اصحاب الحدیث واھل السنۃ فی الاعتقاد

(۱۰۳) "رسالہ کتب بھا الی اھل الثغر بباب الابواب"۔ (اس کو قوام الدین نے ترکی میں مرتب کر کے شائع کیا ہے)

(۱۰۴) "کتاب الامام"

(۱۰۵) کتاب الابانہ عن اصول الدیانۃ (مطبوعہ حیدرآباد ۱۳۲۱ھ)

(۱۰۶) کتاب کشف الاسرار وھتک الاستار (شاید یہ ان کتابوں میں موجود ہو جو اوپر بغیر کسی عنوان کے درج ہیں)

مقالات شبلی حصہ پنجم

یہ مولانا شبلی کے ان مقالات کا مجموعہ ہے جو اکابر اسلام کے سوانح و حالات سے متعلق ہیں، اس میں علامہ ابن تیمیہ، ابن رشد اور زیب النساء کی سوانحعمری وغیرہ جیسے اہم اور مفید مضامین ہیں۔

منیجر

آثارِ علمیہ و تاریخیہ

مکتوب مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ

بنام

سید عبدالحکیم صاحب دسنوی

بانی گلہ، پالن جی ہوٹل

بمبئی

عم محترم! تسلیم

میں نے پہلے خط میں آپ کو اطلاع دی تھی کہ مدراس محمڈن کانفرنس کی شرکت کے لیے مدراس جا رہا ہوں، ۲۵ جولائی کو یہاں سے روانہ ہوا، اور ۸ اگست کو واپس آیا،

یہ سفر میرے تمام سفروں میں سب سے زیادہ مفید و پر از معلومات رہا، ۲۵ کو روانہ ہوا، ۲۶ کو گنتکل پہنچا جہاں سے بنگلور (مقام کانفرنس) کو گاڑی جاتی تھی، اتفاق سے جس درجہ میں میں تھا اسی میں مسٹر شوکت علی بھی تھے، کانفرنس، یونیورسٹی، کالج اور اشاعت اسلام پر متفرق گفتگوئیں ہوئیں، انکا نفرنس کے متعلق ہمارے اکثر اعتراضات کو انھوں نے تسلیم کیا، یونیورسٹی کے متعلق یقین دلایا کہ گورنمنٹ کو مجبوراً یونیورسٹی کو حقِ الحاق دینا پڑیگا، طرابلس و ایران و مراکو کے حالات بدسے جیسا ہر مسلمان متاثر ہے وہ بھی تھے،

صبح کو گاڑی بنگلور پہنچی، اسٹیشن پر والنٹیر موجود تھے،

بنگلور | ریاست میسور کا بہترین شہر ہے، آب و ہوا کے لحاظ سے تمام جنوبی ہندوستان میں مشہور، آجکل وہاں اچھا خاصا جاڑا تھا، اور موسم گرما میں بھی وہاں سردی و گرمی کا اعتدال رہتا ہے، غرض یہ کہ وہاں

گرمی کبھی نہیں ہوتی، اس شہر کا ایک حصہ لشکرگاہ انگریزی ہے، اور یہی کانفرنس کا مقام تھا، یہ رزیڈنسی ہے، دوسرا حصہ شہر ہے جو ریاست کے ماتحت ہے۔

عمارتیں دور دور، پست، کھپریل، مگر صاف ستھری ہیں، انتظام عمدہ ہے، پولیس اچھی ہے،

نباتات کا ایک عالم یہاں ہے، زمین کا رنگ عموماً سرخ ہے، اور نہایت زرخیز اور عمدہ ہے، سرد جسکے ایک ذرہ کا وجود بھی ہمارے باغوں کے لیے باعثِ سربلندی ہے، یہاں اس کا جنگل ہے، میوہ ہر قسم کا یہاں ہوتا ہے، انار میں نے یہاں بہت بڑے بڑے دیکھے، مدراس میں انگور کے درخت دیکھے، سپاری کا درخت دیکھا، کھجور کے درخت نہایت کثرت سے ہیں،

کانفرنس | کانفرنس تین دن رہی، جسٹس عبدالرحیم پریسیڈنٹ تھے، ہندوستان سے تین آدمی شریک تھے، ہیں، خواجہ کمال الدین اور مسٹر شوکت علی، کانفرنس کا مقصد جنوبی ہندوستان میں اشاعت تعلیم ہے، کانفرنس اپنا کام انجام دے رہی ہے، اس سے زیادہ جتنا آل انڈیا کانفرنس انجام دیتی ہے۔

کانفرنس کے روح رواں بلکہ جنوبی ہندوستان کی تمام تحریکات کے روح رواں صرف دو شخص ہیں، نواب غلام احمد اور مسٹر قریشی بی اے، نواب غلام احمد ایک باثروت شخص ہیں لیکن قومی محبت سے ان کا دل لبریز ہے، قومی کاموں سے ان کو اس سے زیادہ دلچسپی ہے جتنی ان کو اپنے ذاتی کاموں سے ہے، قومی مصائب پر ان کا دل اسی قدر جلتا ہے جتنا ذاتی مصائب پر، ہر سال اپنے ہزاروں روپے قوم کے لیے نذر کرتے ہیں، آجکل بیمار تھے، شریک کانفرنس نہ ہوئے، مسٹر قریشی، مدراس کا عبدالحکیم ہے، بی اے بی ٹی ہے، گورنمنٹ نوکر تھا، مگر سب چھوڑ چھاڑ کر، مدراس کے قومی ہائی اسکول میں ہیڈ ماسٹر ہے، انگریزی زبان پر بلا کا قابو رکھتا ہے، مدراس کے اکثر روزانہ و ہفتہ وار انگریزی اخبارات میں اس کے مضامین چھپتے رہتے ہیں،

کانفرنس کا اجلاس تین دن رہا، مختلف تعلیمی ضرورتوں پر لکچر ہوئے، تعلیمی تجاویز منظور ہوئیں، میں نے دو تقریریں کیں، ایک تعلیم نسواں پر جس نے حاضرین پر اثر کیا اور پسند کی گئی، اس تقریر میں ایک یورپین

خاتون کے مخفی اعتراضات کا جواب بھی تھا جس نے مجھ سے پہلے اسی موضوع پر انگریزی میں تقریر کی تھی، دوسری تقریر شب کو مذہبی تھی جس کا اثر خاطر خواہ نہ ہوا،

ختم اجلاس پر میں نے احباب کے ساتھ جس میں خصوصیت کے ساتھ میں دو کا نام ضرور لوں گا، مسٹر قریشی اور مسٹر اسد اللہ بی اے، حیدرآباد میں رجسٹرار ہیں، وطن مدراس ہے اور قومی درد رکھتے ہیں، بنگلور کا مشہور عجائب خانہ دیکھا جس میں میں نے دو اسلامی چیزیں دیکھیں، ایک پتھر پر ایک کتبہ جو سلطان ٹیپو کی کسی عمارت پر تھا، دوسرا ایک سنگی نقشہ جو حیدر علی کے تیار کردہ قلعہ و عمارات واقع سرنگا پٹن پایۂ تخت سلاطین میسور کا تھا، محبت سے میں نے انکو دیکھا، دل میں ایک درد اٹھا، بے اختیار ہو گیا، اور جی چاہا کہ اس افق کو دیکھتا جہاں ہندوستان کا آخری ستارہ طلوع ہوا اور ڈوبا۔

راستہ میں دوستوں سے ذکر کیا، اسد اللہ خاں معیت کے لیے تیار ہو گئے، وہ بھی مدت سے اس کے آرزومند تھے، قرار یہ پایا کہ میں پہلے بریع کو مسٹر قریشی کے ساتھ کولار جاؤں جہاں نواب غلام احمد خاں مقیم تھے، اور انکی عیادت کروں، شام کو واپس بنگلور آؤں، یہاں اسد اللہ خاں اسٹیشن پر طیار ملیں گے، ان کے ساتھ سرنگاپٹن کا ارادہ کروں۔

حسب قرارداد کولار روانہ ہوا، یہاں سے ۲ گھنٹہ کا راستہ تھا، نواب غلام احمد اور انکے برادر بزرگ دونوں کو حد درجہ خلیق اور خاکسار پایا، مگر نہایت خوش ہوا کہ ہندوستان کی اسلامی خاکستر میں اب تک بی دبائی چنگاریاں باقی ہیں۔

یہاں سب سے قابل سیر چیز سونے کی کانیں ہیں جو ریاست میسور کی ملک ہیں، ۲ بجے اسکو دیکھنے چلا، اس کے لیے پہلے ریاست کے عہدہ دار سے ایک اجازت نامہ حاصل کرنا پڑتا ہے، اس اجازت نامہ کی وساطت سے انگریزی کمپنی سے جو کان کی ٹھیکہ دار ہے، دوسرا اجازت نامہ ملتا ہے، ریاست اور کمپنی دونوں کے سپاہی ساتھ ہوتے ہیں پھر کان کی سیر نصیب ہوتی ہے، ہرحال ان مراحل کو طے کرکے کان کے کارخانہ تک پہنچا، کانیں میلوں تک ہیں، نیچے نیچے کھودی جاتی ہیں اور اوپر معمولی سطح زمین نظر آتی ہے، میں نیچے نہیں اترا، نیچے اترنا عام آدمیوں کیلیے خطرناک ہے، صرف اوپر کی سیر کی، ایک کارخانۂ قدرت نظر آیا، ہر قدم پر انسان کی قوت کمال عقلی اور خدا کی صنعت فیاضی کے مناظر نظر آئے، وہ جگہ دیکھی جہاں مشین کی مدد کے

ذخو اہعہ، مزدور نیچے اترتے ہیں، ڈیڑھ دو ہزار فٹ نیچے کان ہے، لیکن صرف ایک منٹ میں زینے سے نیچے آتے، اور اوپر جاتے ہیں، زینوں کے نیچے اوپر جانے کے لیے الگ ایک مشین کا مستقل کارخانہ اور عملہ ہے، اندر روشنی اور ہوا پہنچانے کا الگ کارخانہ اور عملہ ہے، وہ جگہ دیکھی جہاں کانوں سے توڑ توڑ کر اوپر سونے کے پتھر لاتے ہیں وہ جگہ دیکھی جہاں وہ پتھر توڑے جاتے ہیں، وہ مشین دیکھی جو ان پتھروں کو چورہ کرتی ہو، وہاں گیا جہاں سونے اور ذرات خاکی الگ ہوتے ہیں، پھر یہ خاک دوسری جگہ پانی کے ساتھ ملکر جاتی ہے، وہاں پر صاف کی جاتی ہے، یہی خاک پھر دوسری بار صاف کیجاتی ہے، تیسری بار خاک ہوائی اڑن کھٹولوں پر روانہ کیجاتی ہے، جس کو میں نے حیرت سے دیکھا، یعنی ایک پست مقام سے بلند مقام پر تار پر آہنی صندوق بلا مدد کے جاتے ہیں، اوپر سے نیچے نشیب میں آنا معلوم لیکن من دو من کی خاک سے لدے ہوئے آہنی صندوقوں کا آہنی تاروں پر بلندی کی طرف دوڑ کر جانا میرے لیے طلسم ہوش ربا کا ایک منظر معلوم ہوتا تھا، بہرحال یہاں کے عجائبات دیکھکر یہ سمجھ میں آیا کہ ہندوستان کو ترقی کے کس معیار تک پہنچنا ہے۔

میسور کان سے واپس آکر شام کی گاڑی سے بنگلور واپس آیا، اسد اللہ خان اسٹیشن پر موجود تھے، میسور کی راہ لی، صبح سات بجے ہم میسور پہنچے، شہر دیکھا، راجہ کا خاص محل دیکھا، اتفاق سے محل کے سامنے ریاست کی کچھ فوج مصروف ورزش تھی، اس کا نظارہ کیا، شہر، شہری حیثیت سے پست ہے، پست و بدصورت مکانات، گندہ سڑک، بدہیئت دکانیں پایہ تخت میسور کی سرمایہ ناز چیزیں ہیں، بعض عمارات اس سے مستثنیٰ ہیں، مگر وہ خال خال ہیں، راجہ کا محل عالیشان اور خوبصورت ہے، مگر میری آنکھیں فلک نما کو ڈھونڈھتی تھیں،

بہرحال اس شہر کا گشت لگاتے ہوئے ہم سرنگا پٹن کو چل کھڑے ہوئے جو یہاں سے بارہ میل ہے، درمیان کے مقامات میں جابجا اسلامی عمارات کے نشانات ملتے تھے، کہیں کہیں شہدا کی قبریں نظر آتی تھیں، جو اسلام کی آخری عظمت کے خاتمہ کا قصہ سنا رہی تھیں، راستہ میں ایک پل نظر پڑا، جو کاویری ندی کی ایک شاخ پر تعمیر کیا گیا ہے، تمام انگریزی پلوں کے برخلاف اس کے ستون مخروطی مثلث کی بجائے مربع تھے، جو بالکل عجیب و غریب چیز ہے، وہ ستون بھی محض ایک سالم پتھر سے تراش کر بنائے گئے ہیں،

تھوڑی دیر میں وہ میدان، وہ دیواریں نظر آئیں جو سلطانی فوج کی ورزش گاہ تھیں، اور جہاں نشانہ کی مشق ہوتی تھی، آگے چل کر اس بدنصیب پایہ تخت کا سواد نظر آیا جو اب بالکل ایک معمولی گاؤں کی حیثیت رکھتا ہے، ہر جگہ شہدائے اسلام اور انگریزی سپاہیوں کی قبریں ہندوستان کے آخری فیصلہ قسمت کی طرف اشارہ کر رہی تھیں،

سب سے پہلے ہم نے سلطان کے مزار کا قصد کیا، ایک وسیع باغ کے اندر خود سلطان کا بنا کردہ قبرستان ہے جہاں اکثر خاندانِ سلطانی کے ارکان مدفون ہیں، صدر دروازہ کی سقف پر اب تک نوبت و نقارہ بج رہا ہے، جسکی مہیب آوازیں ہمارے کانوں میں الفاظ ماتم و تعزیت بنکر آ رہی تھیں، وسط میں سلطانی مقبرہ تھا جس پر ایک عظیم الشان گنبد تھا، گنبد کے دروازہ پر چند کتبے تھے، جن کو میں نے لکھ لیا ہے، ایک دروازہ کے اوپر، ایک دروازہ کی داہنی طرف کی دیوار پر اور ایک بائیں طرف کی دیوار پر جس کی صورت یہ ہے۔

در شاہے کہ شہرۂ الاسلام — باب شیرے کہ کسرۂ الاصنام

او ست سلطانِ دین و ہم دنیا — بندۂ بارگاہِ او علام

(بجانب راست)

بسم اللہ الرحمن الرحیم — اللہ محمد ابوبکر عمر عثمان علی

زہے گنبد کز شکوہ بنا — فلک زیر دستش بود در علو

تو خواہی فلک خواہ خورشید خوان — فلک داغ گردید از رشک او

بود شمسہ اش نور چشم فلک — قمر یافتہ ضو بتعلیم ازو

تراوش کنان بحر رحمت ز خاک — گرد بے زکر وبیاں گرد او

سحر گر پے کسب فیض و شرف — گذشتیم ازیں خوابگاہ نکو

چوں ایں مضجع تازہ آمد بچشم — نمودم چو روحانیاں جستجو

کہ ایں شاہ آسودہ را نام چیست — چہ تاریخ رحلت نمود است او

(بجانب چپ)

بسم اللہ الرحمن الرحیم — رب ارحم السلطان الکریم

ٹیپو سلطان شہید شد ناگاہ — خون خود ریخت فی سبیل اللہ

بود ذیقعدہ بست و ہشتم آں — شدہ در روز شنبہ حشر عیاں

بہر سالش بہ نیم ماہ بگفت — نور اسلام و دین ز دنیا رفت

تاریخ کشتہ گشتن سلطان حیدری — ٹیپو بوجہ دین محمد شہید شد

جواں مرد میدان نہاں شد ز دنیا — یکے گفت تاریخ شمشیر گم شد

روح قدسی بہ عرش گفت کراہ — نسل حیدر شہید اکبر شد

ان اخذت مصکم لما قد ذکروا — وس بج فلق اخفت ہ و جہا

یک زاں میاں گفت تاریخ و نام	کہ حیدر علی خاں بہادر بگو
مصیبۃ ما مثلہا ارختہا	ذہب عزالروم والہند کلہا

قد صفہ الحقیر میر حسین علی و حررہ سید عبد القادر بالخط الجلی

عربی کا قطعہ عروض و نحو کے اعتبار سے غلط ہے، لیکن درد جانگدازی صحتِ الفاظ پر منحصر نہیں،

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے — نالہ پابند لے نہیں ہے

عربی قطعہ اس اتفاق مصائب کا اظہار کر رہا ہے جو عالم اسلام کو تیرہویں صدی عیسوی کے اواخر یا تیرہویں صدی ہجری کے اوائل میں ہندوستان و مصر میں برداشت کرنا پڑا، ادھر قاہرہ نپولین کے زیر قدم تھا اور ادھر سرنگاپٹن پر یونین جیک لہرانے لگا،

یہ ایک جملہ معترضہ تھا، مقبرہ میں ایک دروازہ سے داخل ہونا پڑتا ہے، جس میں سیاہ غالباً آبنوس کے کواڑ ہیں، اندر تین قبریں برابر اس طرح تھیں

سلطان ٹیپو شہید	حیدر علی	حیدر علی بیگم

سلطان ٹیپو کی قبر پر سرخ چادر اور دونوں قبروں پر سیاہ چادریں چڑھی تھیں، سرخ چادر اس خونی پیرہن کی طرف اشارہ ہے جسکو پہنے سلطان سو رہا ہے، او شیر میسور! اٹھ! کہ اب اسلام تیری مدد کا محتاج ہے، ایک آواز تھی جو زبانِ دل سے بے اختیار نکلی اور جسکو صرف گوشِ دل نے سنا، مگر ہائے مہمان نواز، عاشقِ اسلام سلطان کے لبِ گور نے کوئی جواب نہ دیا، فرطِ محبت سے جی چاہا کہ گستاخانہ قبر سے لپٹ کر ایک چیخ ماروں، لیکن خدام ادب نے آواز دی کہ ادب! ادب!! آخر ہاتھ اٹھا کے اور فاتحہ کے چند پھول چڑھا کر باچشمِ نم باہر نکل آیا،

مزار کے سامنے سلطانی مسجد تھی جس میں مجاور اور مسلمان نماز بھی پڑھتے ہیں، عمارت متوسط حیثیت کی ہے، یہیں سے نیچے اتر کر دونوں بازوؤں میں دو مسقف عمارتیں ہیں جن کو مہمان سرائے سمجھتا ہوں،

مزار پر اب تک مجاور، قرآن خواں، اور نوبت و نقارہ بجانے والے ریاست کی طرف سے مقرر ہیں،

یہاں سے نکل کر ایک طرف اس دشمن اسلام خاندان کے ایک ممبر کا گنبد قبر ہے، جس کا ایک رکن بنگال میں میر جعفر کے نام سے مشہور ہے اور دوسرا رکن میر صادق کے نام سے یہاں معروف ہے، اور جو سلطان شہید کا نمکحرام

وزیر اور اسلام کا فرزند تھا، دروازہ بند تھا، میرے رفیق نے بیان کیا کہ اسکی قبر پر جوتوں کا ڈھیر پڑا ہے، جب زائر کا وہاں گذر ہوتا ہے تو وہ اب تک جوتوں کی نذر اسکی قبر پر پیش کرتا ہے، دل چاہا کہ دامن چشم اس مجرم اسلام کے دیدار سے آلودہ کروں،

دریا دولت باغ پہنچا، یہ ایک باغ ہے جس کے وسط میں ایک عالیشان عمارت ہے جسمیں سلطان رہا کرتا تھا، عمارت غالباً لکڑی کی ہے یا مجھے ایسا معلوم ہوا، تمام دیواریں اور سقف مختلف خوشنما رنگوں سے رنگی تھی جس پر نہایت باریک بوٹے بنے تھے، سب سے پہلے یہاں سیاح کی جس چیز پر نظر پڑتی ہے، وہ اس عمارت کے سامنے کی دیوار ہے، تمام دیوار پر سلطان ٹیپو اور حیدر علی کے معرکوں کی تصویریں ہیں، ابتدائے معرکہ سے لیکر آخیر معرکہ تک کی تصویر ہے، اور پھر اسکی مختلف اوقات کی تصویریں ہیں، کہیں وہ مجلس رقص و سرود میں بیٹھا نظر آتا ہے، کہیں وہ سویا ہے، کہیں اسکی گردن شہنشاہ حقیقی کے سامنے جھکی نظر آتی ہے، کہیں وہ بیٹھا قرآن مجید تلاوت کر رہا ہے، غرض عجیب منظر ہے، گھنٹوں تک حیرت نے میرے ہاتھ پاؤں باندھ دیے اور میں تعجب اور حسرت سے ایک ایک سپاہی، ایک ایک سوار بلکہ ایک ایک چیز کو دیکھ رہا تھا، آخر رفیق کی آواز نے چونکا دیا اور ہم یہاں سے نکلے،

قلعہ دیکھا جو صرف پتھروں سے بنایا گیا تھا اور جس کے چاروں طرف کاوری ندی طواف کرتی ہے، قلعہ توڑ دیا گیا ہے، کچھ کچھ آثار باقی ہیں، قلعہ کے دروازہ سے نکل کر سامنے شاہی جامع مسجد سنگی نظر آئی، نیچے مکتب یا مدرسہ کے کام کی عمارت ہے اوپر مسجد ہے، وسیع اور عالیشان ہے، منارہ بلند ہے، تقریباً سو ڈیڑھ سو زینے ہیں، ابتدائی زینے سنگی اور آخری ہزمی ہیں، مسجد میں ایک کتبہ ہے جس میں پانچ شعر ہیں، میں نے صرف دو نقل کیے ہیں۔

(اول)	گر حضرت سلیمان اندر زمانِ ماضی	تعمیر مسجدے کرد نامش نہاد اقصیٰ
(آخر)	مانند زر چو پا گشتم قاری برائے تاریخ	طاعت سرائے ثابت ہاتف نمود القا

یہاں کی سیر ختم ہو چکی تھی، اسٹیشن پہنچا، یہاں سے بنگلور روانہ ہوا، بنگلور سے ٹی انباڑی کی طرف روانہ ہوا، ریاست میسور کا اب علاقہ ختم ہوا، میسور کے متعلق میری رائے حیدرآباد سے زیادہ بہتر ہے، تعلیم یہاں نہایت عام ہے، اسکول سے ہر جگہ لڑکے اور لڑکیاں آتی جاتی دکھائی دیتی تھیں، اسکولوں کی تعداد نہایت کافی ہے، کالج بھی ہے،

نانا انسٹیٹیوٹ ہے جہاں مختلف صنعت و حرفت کی تعلیم ہوتی ہے، عورتوں میں بھی تعلیم شائع ہے، پردہ نہیں ہے، آزادی ہے، اس لیے لوگوں کی رائے ہے کہ اخلاقی حالت اچھی نہیں، ایک عجیب بات یہاں کی نسبت سنی کہ یہاں ہندوستانی محبوبائیں یورپین و یوریشین عاشق اور یورپین اور یوریشین معشوق اور ہندوستانی عاشق نہایت کثرت سے ہیں،

مسلمانوں میں یہاں بھی وہی مرض ہے جو ہر جگہ ہے یعنی جہالت، اب تعلیم پھیل رہی ہے، ایک محمڈن سنٹرل ایسوسی ایشن آف میسور قائم ہے جسکی طرف سے کچھ نائٹ اسکول قائم ہیں، کچھ واعظ ہیں جو مسلمان قیدیوں میں وعظ کہتے ہیں، چندہ طرابلس میں یہاں کے مسلمانوں نے بھی حصہ لیا اور تقریباً ۲ ہزار کا چندہ ہوا، یونیورسٹی میں ۲۰ ہزار کا فنڈ وصول ہوا، ایک فری ریڈنگ روم قائم ہے اور بھی قومی تحریکیں مثلاً مسلم ہال، تعلیمی وظائف، انتظام اوقاف اسلامیہ جاری ہیں، مگر ان تمام تحریکات کا نفس ناطقہ کون ہے؟ نواب غلام احمد،

وانمباڑی، دامن کوہ میں ایک متوسط اسلامی آبادی ہے، باشندے زیادہ تر مسلمان ہیں اور خوشحال تاجر ہیں، قومی تخیل یہاں قابل تعریف ہے، مسلمانان مدراس کا قومی ہائی اسکول یہیں قائم ہے، یہاں تقریباً دس بارہ مسلمانوں کے ابتدائی مدارس، دو زنانہ مدرسے، دو کلب، دو عربی مدرسے اس ہائی اسکول کے سوا اور موجود ہیں، ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر مسٹر قریشی ہیں،

اس شہر میں میری دو تقریریں ہوئیں، ایک ہائی اسکول میں طلبہ اور ماسٹروں کے سامنے، موضوع بحث "تعلیم" تھا، دوسرا اسی شام کو بعد مغرب جامع مسجد میں حب رسول پر وعظ کہا،

وانمباڑی سے ۱۳-۱۴ میل کے فاصلہ پر ایک تاریخی مقام گرام بور ہے، یہیں وہ میدان ہے جہاں چاند خاں اور انور الدین خاں میں حکومت کرناٹک کیلیے فیصلہ کن لڑائی ہوئی، دونوں مدعی تھے، چاند خاں کے طرفدار فرانسیسی تھے اور انور الدین خاں کے انگریز، انور الدین خان کو مارا گیا لیکن فتح انگریزوں کو ہوئی، یہیں وہ پہاڑ واقع ہے جسپر ایک نہایت مضبوط قلعہ تعمیر تھا، اسی پہاڑ کے سلسلہ میں حیدر علی اور ٹیپو نے اپنی وہ جنگی سڑک طیار کی تھی جسپر میسور سے چلکر چھپتا چھپاتا ساحل ملیبار تک پہنچ جاتا تھا اور انگریزوں کو خبر تک نہ ہوتی تھی، اس قدیم سڑک کا نشان اب تک باقی ہے، یہیں والی کرناٹک کا ایک مستحکم قلعہ میدان میں تھا جسکی کچھ دیواریں اور دروازہ اب تک باقی ہے، جو کہ دور گذشتہ کا گویا ایک حرف نقش قدم ہے، میں احباب کے ساتھ گرام بور گیا، ایک ایک چیز دیکھی، پہاڑ پر چڑھا، میدان میں پھرا، انور الدین خاں کے مقام شہادت پر ایک چبوترہ بنا ہے، قبر یہاں نہیں ہے، مگر مجاور ہیں، مجاوروں کا کچھ وقف ہے،

پہاڑ پر ایک دو کمینگاہ اب تک موجود ہیں، یہاں میدان میں ایک معمولی سی مسجد اور گنبد قبر ہے جو زمانہ جنگ کے پہلے کی تعمیر ہے، مسجد پر کتبہ لگا ہے،

میر صفدر عز شانہ، منبع جود و کرم — ساخت مسجد بہر طاعت فی المثل بیت الحرم

گفت رضوانم بگو تاریخ ایں عالی بنا — ختم شد از فضل رب مسجد کبیت محترم

سنہ ۱۱۲۰

محمد قانع — کتبہ ابو تراب — باہتمام میر محمد حسین عرف سید کری

یہاں کی زیارت سے واپس آکر ایک دن کے بعد وہاں پہنچا جو میرے سفر کا منتہی تھا یعنی شہر مدراس، مدراس میں ڈیڑھ دن ٹھہرا، نواب غلام احمد کا وہاں کمرشل آفس ہے، نواب صاحب کے نائب محی الدین صاحب اسٹیشن پر موجود تھے، تپاک سے ملے اور جتنی دیر ہم رہے اخلاق و محبت سے ملتے رہے، ڈیڑھ دن کیلیے آفس کی موٹر میرے لیے وقف کر دی، اتنی مدت میں جو کچھ دیکھ سکا دیکھا، یہاں کی مشہور چیزیں: مچھلیوں کا عجائب خانہ، ہائیکورٹ کی عمارت، لاکالج، کرسچین کالج کا فورٹ سینٹ جارج، ساحل مرینا وغیرہ ہیں، یہ تمام چیزیں دیکھیں،

مچھلیوں کا عجائب خانہ یہاں کی مشہور اور مخصوص چیز ہے، سمندر کے کنارہ ایک مختصر عمارت ہے جسکے چاروں طرف شیشہ کی الماریاں ہیں، جن میں پانی بھرا ہے، پانی اور مچھلیوں کی اصلی قوت قائم رکھنے کیلیے برقی تار اس میں دوڑائے ہیں، ان مختلف الاشکال مختلف الالوان مچھلیوں کو دیکھکر خدا کی قدرت نظر آئی، کوئی شکل کوئی رنگ ایسا نہ ہوگا جسکی مچھلی نہ ہو، عجائب المخلوقات کے مصنف کہتے ہیں جس طرح اٹھارہ ہزار مخلوق عالم میں خدا نے پیدا کی ہے اسی طرح اٹھارہ ہزار عالم بحر میں بھی ہے، اس عجائب خانہ کو دیکھکر میں اس مسئلہ پر ایمان لے آیا،

یہاں کا مردہ عجائب خانہ دیکھا، مگر عجائب خانہ کلکتہ کے سیاح کیلیے کوئی دلچسپی کی چیز نہیں، البتہ اسلحہ خانہ میں کچھ دلچسپی ہے، مگر میں نے صرف ایک چیز یہاں دیکھی اور وہ گویا میری سیر کا حاصل تھی، یعنی دو قلمی تصویریں سلطان حیدر علی اور ٹیپو کی فوجی نقل و حرکت کی، بیچ میں سلطان کا ہاتھی جسپر سلطان سوار ہے، امرا گھوڑوں پر آگے پیچھے ہیں، توپوں کا سلسلہ ایک طرف ہے، سوار دو خط مستقیم میں منقسم ہوکر داہنے بائیں آگے پیچھے پیدل ہیں، اونٹوں پر خیمے لدے ہیں، سب کے آگے ہاتھی پر سرخ پرچم لہرا رہا ہے، اور اسی قواعد کے ساتھ فوج کوچ کر رہی ہے، عجیب سماں آنکھوں کے سامنے پھر گیا، میرا جسم اس وقت گو بیسویں صدی میں تھا لیکن میری روح ڈیڑھ صدی پیچھے کے منظر آنکھوں سے دیکھ رہی تھی، ایک کتبخانہ بھی وسیع ہے، انگریزی کتابوں کا انبار، مشرقی شاخ کی نسبت دریافت کیا، تو معلوم ہوا کہ یہاں یہ شاخ نہیں، تعجب ہے پھر حکومت کرناٹک کا کتبخانہ کہاں گیا، ہائیکورٹ کی عمارت اسلامی طرز کی تھی، دریافت سے معلوم ہوا کہ کوئی

اسلامی عمارت تھی جسکو قطع و برید کے بعد ہائیکورٹ بنایا گیا،

یہ سب چیزیں دیکھیں مگر میری آنکھ اس چند بالشت زمین کی زیارت کی مشتاق تھی، جہاں اسلامی علوم و فنون کے بحر زخار کی موجیں سمٹ کر سما گئی ہیں، یعنی بحر العلوم کی تربت پاک، نواب والاجاہ والی کرناٹک کی بنوائی ہوئی یہاں پتھر کی ایک عظیم الشان جامع مسجد ہے، اسی کے ایک پہلو میں بعض شاہان ارکاٹ کا مقبرہ ہے، بحر العلوم کی قبر بھی ان ہی سلاطین کے پہلو بہ پہلو ہے، علم کے تاجدار کا رتبہ دولت و مملکت کے تاجدار سے کم نہیں، مرقد مبارک کے سامنے کھڑے ہو کر فاتحہ پڑھا، افسوس قبر پر کوئی کتبہ نہیں، جاہل قرآن خوان مقرر ہیں جو ایصال ثواب کیلیے ہر روز وہاں بیٹھکر قرآن پڑھا کرتے ہیں، ان سے اس شہر خاموش کے بعض باشندوں کے نام و حالات پوچھے تو وہ انتہائے جہالت کی وجہ سے اتنا بھی نہیں بتا سکے کہ ان گمنام ناموروں کے نام کیا ہیں،

یہاں ایک ہمارا ہم وطن بھی سو رہا ہے جسکی قبر پر پتھر کا ایک کتبہ ہے جس پر اس کا نام اور تاریخ وفات کندہ ہے، نام وجیہ الدین ابن محب اللہ باشندۂ عظیم آباد کندہ ہے، تاریخ وفات سنہ ۱۲۲۹ھ لکھی ہے،

جامع مسجد وسیع اور عالیشان، مادۂ تاریخ شعرا نے اچھا نکالا ہے،

امیر الہند والاجاہ فرمود　　　بنا ایں مسجد فرخندہ منظر

ز دل از بہر تاریخ بنایش　　　ندا آمد کہ ذکر اللہ اکبر

ساخت جائگہ اسلام شہ دین پرور　　　آنکہ فرماں بر آں ہست زمہ تا ماہی

بہر تاریخ بنایش بجز دہاتف گفت　　　نام فرخندۂ وے مسجد والا شاہی

اسی روز رات کو ۱۰ بجے کی گاڑی سے مدراس سے بمبئی روانہ ہوا، راستہ میں دو شہروں کے دیکھنے کو دل مچلا، گلبرگہ اور پونہ، مگر آیندہ کے وعدہ پر سمجھایا تو بارے مان گیا،

جسٹس عبد الرحیم سے مدراس میں ملنے کا وعدہ تھا، مگر افسوس قلت فرصت کی وجہ سے نہ مل سکا، جسٹس موصوف متواضع اور خاکسار ہیں، اور متاثر دل رکھتے ہیں، مجھ سے نہایت خلوص سے بار بار ملے۔

والسلام

سید سلیمان

۱۵ اگست ۱۹۱۲ء

ادبیات

غزل

از جناب چندر پرکاش صاحب جوہر بجنوری

جناب چندر پرکاش جوہر بجنوری ایک ہونہار نوجوان شاعر ہیں، شاعری کا نہایت ستھرا مذاق رکھتے ہیں، ان کے کلام میں کہنہ مشقی کی پختگی ہے لیکن مشاعروں اور صحافتی دنیا سے کم تعلق رکھتے ہیں، اس لیے ان کے کلام کی وہ شہرت نہ ہو سکی جس کا وہ مستحق ہے اور ایسے "جوہر قابل" کی حوصلہ افزائی ایک ادبی فریضہ ہے، اس لیے ان کے جواہر پارے ناظرین کی ضیافت کیلیے وقتاً فوقتاً پیش ہوتے رہیں گے،

کھل سکے گا نہ کوئی راز نہاں میرے بعد　　　کون سمجھے گا محبت کی زباں میرے بعد

چشمک برق تھی بس میرے نشیمن کے لیے　　　صحن گلشن سے اٹھا پھر نہ دھواں میرے بعد

دشت غربت میں لٹا آہ مرا رخت حیات　　　منزلیں ہو گئیں بے نام و نشاں میرے بعد

وہ فسانہ جسے چھیڑا تھا ازل ہی میں نے　　　کون جانے کہ ہوا ختم کہاں میرے بعد

کچھ تو پہلے ہی سے دھندلے تھے محبت کے نقوش　　　اور مبہم ہوئی تصویر جہاں میرے بعد

میں نے اک آہ میں کل شرح محبت کر دی　　　لوگ کرتے رہے تفسیر فغاں میرے بعد

میرے دم تک ہے زمانے میں تغیر جوہر

ختم ہو جائے گا سب کار جہاں میرے بعد

غزل

از جناب رشید کوثر خیر آبادی

جیسے نغمہ ختم ہو جانے سے کچھ پہلے کی بات
ہائے وہ امید بر آنے سے کچھ پہلے کی بات

راہ رو منزل کا پہلے فیصلہ کر تو سہی!
جس طرح عنوان ہے افسانے سے کچھ پہلے کی بات

ہر تمنا خاک میں مل مل کے باقی ہے نمو
سبزہ کہتا ہے نکھر آنے سے کچھ پہلے کی بات

امنِ ساحل کے تجسس میں بچی بحر کشتیاں
یہ ہے ٹکرا کر الٹ جانے سے کچھ پہلے کی بات

وہ جہانِ ہوش تھا یا دوزخِ جنت نما
ناصحو! چھیڑو نہ دیوانے سے کچھ پہلے کی بات

فاصلہ چنداں نہیں تخریب سے تعمیر تک
بتکدہ کیا ہے خدا خانے سے کچھ پہلے کی بات

رازِ دل تھا صورتِ غنچہ حجاب اندر حجاب
وہ یقین کا بھول کھل جانے سے کچھ پہلے کی بات

عالمِ تخئیل کی رنگین خاموشی نہ پوچھ!
کیف میں ڈوبی وہ کہہ جانے سے کچھ پہلے کی بات

تیری ان باتوں سے کوثر بدگماں ہو جائیگا
یاد کر اے دوست چندرانے سے کچھ پہلے کی بات

تاثرات

جناب سید شاہ محمد منظور الرحمٰن اختر کاکوی

بادِ بہار ہائے یہ کیا چال چل گئی
مرغانِ خوش نوا کی بھی نیت بدل گئی

تدبیرِ باغباں پہ بھی اک داغ لگ گیا
گلہائے خوشنما کی جو صورت بدل گئی

رسوائیِ چمن کی یہی ہو گئی اک دلیل
اپنی جگہ سے ایک کلی بھی جو ٹل گئی

صحرا سے کیا، چمن سے اٹھی وہ ہوائے تند
چن چن کے ایک ایک کلی کو مسل گئی

کیا باغباں کی اس سے نہ رسوائیاں ہوئیں؟
مانا کہ حسرتِ دلِ گلچیں نکل گئی

قمری و عندلیب کی ہلکی سی چھیڑ سے
دیکھا تو گلستاں ہی کی رنگت بدل گئی

آئی صدا کہ پردہ دل کی ہے یہ نوا
جب بزمِ ناز میں مری اختر غزل گئی

مطبوعاتِ جدیدہ

اردو کی نثری داستانیں۔ از ڈاکٹر گیان چند، صدر شعبۂ اردو حمیدیہ کالج بھوپال، تقطیع بڑی، ضخامت ۸۰۰ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت لعہ، پتہ: انجمن ترقی اردو، پاکستان، اردو روڈ، کراچی۔

لائق مؤلف نے ڈاکٹریٹ کے لیے یہ مقالہ لکھا تھا جس کو انجمن ترقی اردو پاکستان نے کتابی شکل میں شائع کیا ہے، اس میں ابتدا سے لیکر انیسویں صدی تک کی اردو کی داستانوں اور قصوں کی تحقیقی و تنقیدی تاریخ تحریر کی گئی ہے، ادب اردو کی تاریخ کی تقریبًا تمام کتابوں میں ضمنًا اردو کی مشہور داستانوں کا بھی مختصر ذکر ہے، مگر اس تفصیل و تحقیق کے ساتھ پہلی مرتبہ ان کا جائزہ لیا گیا ہے، اس میں مطلق داستانوں کی تاریخ، ان کی پیدایش کے اسباب، ان کے ماخذوں کی بحث، اردو کی داستانوں کی سرگذشت، ان کا مفصل تجزیہ، ان کی تنقید، ان کے مصنفین، طباعت کی تاریخ اور مطبوعہ و غیر مطبوعہ نسخوں وغیرہ تمام پہلوؤں کی پوری تفصیل ہے، یہ کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے، پہلے باب میں مختلف ملکوں اور زبانوں میں داستانوں کی ابتدا اور ان کے ارتقاء کا ذکر ہے، دوسرے میں اردو کی مشہور داستانوں کی تاریخ، ان کے مصنفین، ان کے ماخذوں اور ان کے مختلف نسخوں پر بحث و تنقید ہے، تیسرے میں ان داستانوں کی خصوصیات کا تجزیہ ہے، چوتھے میں دو مشہور طویل داستانوں یعنی داستان امیر حمزہ اور بوستان خیال پر مفصل نقد و تبصرہ ہے، پانچویں میں مختصر قصوں مثلاً آرایش محفل، باغ و بہار اور فسانۂ عجائب کا ذکر اور ان پر بحث و تبصرہ ہے،

چھپے ہیں اسی طرز سے کہانیوں کے مجموعوں مثلاً کلیلہ دمنہ، الف لیلہ اور بیتال پچیسی وغیرہ کا جائزہ لیا گیا ہے، ساتویں میں داستانوں کے عروج و زوال کے اسباب پر روشنی ڈالی گئی ہے، کتاب کے آخر میں تین ضمیمے ہیں، پہلے میں شمالی ہند کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ قصوں کی فہرست اور ان کا مختصر تعارف ہے، دوسرے میں بعض خاص غیر مطبوعہ قصوں کا کسی قدر تفصیلی تذکرہ ہے، اور تیسرے میں ان سب کے مختلف نسخوں اور ان کے ترجموں کا ذکر ہے، یہ اس کتاب کے مباحث کا اجمالی خاکہ ہے، مگر اس میں داستانوں کے مختلف پہلوؤں پر جو دقیق بحثیں ہیں اور مصنف نے ان میں جس تلاش و تحقیق اور نقد و تبصرہ میں جس دقتِ نظر اور حسنِ مذاق سے کام لیا ہے، اس کا پورا اندازہ کتاب کے مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہے، پوری کتاب ان کی محنت، تلاش و تحقیق، وسعتِ نگاہ و دقتِ نظر کی آئینہ دار ہے، اردو ادب پر ایسی بلند پایہ کتابیں کم لکھی گئی ہیں، اس میں مصنف نے متعدد ایسی داستانوں اور ان کے ماخذوں کا انکشاف کیا ہے جن سے اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ تک ناواقف تھے، ادبی پہلو سے بھی یہ کتاب امتیازی حیثیت رکھتی ہے، مصنف کا اندازِ بیان نہایت ادیبانہ، شگفتہ اور سلیس ہے، اس کتاب سے اردو ادب میں محققانہ اور بیش قیمت کتاب کا اضافہ ہوا، یہ بھی عجیب بات ہے کہ ایک طرف ہندوستان سے اردو کو مٹانے کی کوششیں ہو رہی ہیں، دوسری طرف اردو کی ایسی بلند پایہ کتاب ایک ہندو کے قلم سے نکلتی ہے، اس طرح گویا ہر زمانہ میں کعبہ کو صنم خانے سے پاسبان ملتے رہتے ہیں۔

تعارف القرآن - از جناب ڈاکٹر محمد احمد صاحب صدیقی، استاذ شعبۂ عربی الٰہ آباد یونیورسٹی، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۱۲۰ صفحات، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت عہ مصنف اور کتابستان الٰہ آباد سے ملے گی۔

مسلمانوں نے جن جن پہلوؤں سے کلام مجید کی خدمت کی ہے، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس متعلقات پر بہت سے علوم پیدا ہو گئے، اور کلام مجید کے ہر ہر پہلو پر اس کثرت سے کتابیں

لکھی گئیں کہ اس کا کوئی گوشہ بھی تشنہ باقی نہیں ہے، ان کتابوں میں امام سیوطی کی اتقان فی علوم القرآن اپنی جامعیت میں نہایت ممتاز ہے جس میں کلام مجید کے متعلق ہر قسم کے معلومات ہیں، لائق مولف نے اسی طرز پر اردو میں یہ رسالہ لکھا ہے، بلکہ وہ زیادہ تر اسی سے ماخوذ ہے، مصنف نے کہیں کہیں نئے اضافے بھی کیے ہیں، مگر اس کو اتقان کی جامعیت سے کوئی نسبت نہیں ہے، تاہم اس میں کلام مجید کے متعلق بہت سے مفید معلومات یکجا کر دیے گئے ہیں، اس موضوع پر اردو میں بہت کم لکھا گیا ہے، اس لیے یہ کتاب بھی غنیمت ہے، اس زمانہ میں کلام مجید پر لکھنے والوں کو ایک خاص پہلو کو پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے، کلام مجید سے متعلق بہت سے مسائل تو ایسے ہیں جن میں قدیم و جدید کا کوئی سوال نہیں، وہ ہر زمانے میں یکساں رہیں گے لیکن اب تعلیم یافتہ طبقہ کا ذوق اور رجحان بہت بدل گیا ہے، بہت سے پرانے مسائل ان کے لیے بیکار ہیں، بحث و نظر کے بعض نئے پہلو پیدا ہو گئے ہیں، اسلیے بعض ایسی چیزوں کو جن کا عقیدے اور مذہب سے بھی کوئی تعلق نہیں ہے، لکھنے کی ضرورت ہی نہیں ہے، بعض کو نئے رنگ میں پیش کرنے کی ضرورت ہے، بعض نئے مسائل پر لکھنے کی ضرورت ہے، مصنف خود ان امور سے واقف ہیں، اس لیے اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں، امید ہے کہ آیندہ اڈیشن میں اس کا لحاظ رکھیں گے، مگر اس سے کتاب کی افادیت میں فرق نہیں آتا، وہ اپنی جگہ پر نہایت مفید ہے۔

انوارِ حدیث - از مولانا محمد ہاشم صاحب فاضل شمسی، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۲۱۲ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد ہے، اندرون کھاداں کٹ، نیو نہام روڈ، کراچی۔

مغربی پاکستان میں انکارِ حدیث کے فتنہ کی جتنی گرم بازاری ہے، اس نسبت سے اس کے انسداد کا سامان بھی مہیا ہوتا رہتا ہے اور اسکی تردید میں برابر کتابیں نکلتی رہتی ہیں، انوارِ حدیث بھی اسی سلسلہ کی نئی کتاب ہے، اسمیں منکرینِ حدیث کے مشہور اعتراضوں کا جواب دیا گیا ہے، مگر اس موضوع پر اتنا لکھا جا چکا ہے کہ مشکل ہی سے اسکا کوئی جواب طلب پہلو باقی رہ گیا ہوگا، چنانچہ اس کتاب میں زیادہ تر ان ہی پرانے جوابات کو نئے طرز سے

دہرادیا گیا ہے، البتہ روایت حدیث کے تسلسل، اس کی تاریخی حیثیت اور فہم حدیث کے اصول و شرائط وغیرہ کی فنی بحثیں نئی ہیں، جو فائدہ سے خالی نہیں ہیں۔

اسلام تلوار سے نہیں پھیلا۔ مؤلفہ مولانا عبدالباطن صاحب جونپوری تقطیع چھوٹی ضخامت ۹۰ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت ۱۲ر پتہ: کتبخانہ انجمن ترقی اردو، جامع مسجد، دہلی۔

اس کتاب میں غیر مسلم مصنفین و مورخین کی شہادتوں سے ثابت کیا گیا ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے نہیں پھیلا، کتاب کے شروع میں دکھلایا گیا ہے کہ اسلام امن و سلامتی کا مذہب ہے، اس نے کبھی جنگ و قتال میں پیش قدمی نہیں کی، اور جب کبھی اپنی حفاظت کے لیے تلوار اٹھانے مجبور ہوا تو کامیاب ہونے کے بعد ان دشمنوں کے ساتھ بھی فیاضی اور رواداری برتی جو اس کی ہستی کو مٹانا چاہتے تھے، اس سلسلہ میں جہاد کی حقیقت پر بھی روشنی ڈالی گئی اور یہ دکھلایا گیا ہے کہ اسلام میں جبری تبلیغ، دوسرے مذاہب کی توہین اور ان کی عبادت گاہوں کو نقصان پہنچانے کی اجازت نہیں ہے، اس سلسلہ میں اورنگزیب پر جو الزامات لگائے جاتے ہیں، ہندو مورخین کے بیانات سے ان کی تردید کی گئی ہے، اور آخر میں اس خیال کی تردید میں کہ "اسلام بزور شمشیر پھیلا" غیر مسلم علما، و مورخین کے جن میں یورپین اور ہندو دونوں فضلا شامل ہیں، بیانات نقل کیے گئے ہیں، ایک زمانہ میں اس اعتراض کا بڑا شہرہ تھا، مگر اب اس کی حقیقت اتنی واضح ہو چکی ہے کہ اب اس کی مزید تردید کی ضرورت باقی نہیں ہے، تاہم جن لوگوں کے دلوں میں اس قسم کے شبہات ہوں ان کے لیے یہ رسالہ مفید ہے۔

تب و تاب۔ از جناب مولوی محمد یحییٰ تنہا، تقطیع چھوٹی ضخامت ۷۶ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت تحریر نہیں، پتہ: علمی ادارہ نمبر ۳ راج گڈھ روڈ، لاہور۔

صاحب سیر المصنفین مولوی محمد یحییٰ کا تخلص ان کے نام کا جزو لاینفک ہے جس سے قیاس ہوتا تھا کہ وہ شاعر ہیں، مگر ان کا کلام پہلی مرتبہ ان کی تصنیف مراۃ الشعراء میں دیکھنے کا اتفاق ہوا، اب انھوں نے

اس کا مجموعہ شائع کیا ہے، اس کا بیشتر حصہ قومی و ملی اور تاریخی نظموں پر مشتمل ہے، چند غزلیں اور رباعیاں بھی ہیں، اگرچہ مصنف کی شاعری کی عمر نصف صدی کے قریب ہے، مگر کلام کی کمیت و کیفیت دونوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ محض تفنناً شاعری کرتے ہیں، اس لیے ان کے کلام میں شاعرانہ تب و تاب تو نہیں ہے لیکن کہنہ مشق ادیب ہیں اس لیے کلام میں پختگی، سادگی اور واقعیت کا جوہر پوری طرح موجود ہے، اور یہ مجموعہ انکے شعری تبرک کی حیثیت رکھتا ہے۔

رباعیات الہام۔ از ڈاکٹر رگھونندن راج صاحب سکسینہ الہام، تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۰۷ صفحات، کاغذ، کتابت، طباعت بہتر، قیمت عہ پتہ: سب رس کتاب گھر دفتر ادبیات اردو خیریت آباد حیدرآباد دکن۔

مصنف حیدرآباد کے ممتاز رباعی گو شاعر ہیں، رباعیات الہام انکی رباعیوں کا مجموعہ ہے، اسکے ظاہری اور معنوی محاسن مصنف کی کہنہ مشقی کے شاہد ہیں، بیشتر رباعیاں اخلاقی، حکیمانہ اور عارفانہ خیالات پر مشتمل ہیں، زبان نہایت صاف اور سلیس ہے، شاعر کی کمال کی سند کے لیے یہ کافی ہے کہ اس فن کے استاد حکیم الشعراء امجد حیدرآبادی نے ان رباعیوں کی داد دی ہے، جو اس کتاب کے مجموعہ میں شامل ہے، اور ڈاکٹر زور جیسے نقاد ادیب نے اس پر دیباچہ لکھا ہے اور اس کی تحسین کی ہے۔

فکر و نظر۔ مرتبہ جناب ڈاکٹر مسعود حسین صاحب، تقطیع بڑی ضخامت ۸۴ صفحات، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت ۔ے سالانہ، علاوہ محصول ڈاک، پتہ آزاد کتاب گھر، کلاں محل، دہلی۔

فکر و نظر ادارہ ادب اردو علیگڈھ کا چار ماہی رسالہ ہے، اسکا پہلا نمبر کئی مہینے ہوئے ریویو کیلئے آیا تھا، مگر اب اسکی نوبت آسکی، اس زمانہ میں کسی زبان کا ادب زمانہ کے حالات، نئے افکار و نظریات اور زندگی کے مسائل سے الگ نہیں رہ سکتا، اس لیے اردو ادب کا بھی اس سے متاثر ہونا ناگزیر تھا جس سے نیا ترقی پسند ادب پیدا ہوا، مگر ہر نئی تحریک کی طرح ابتدا میں اسمیں بھی بڑی بے اعتدالی رہی اور ہر قسم کے خرافات کو ترقی پسند ادب کا نام دیدیا گیا، مگر اب رفتہ رفتہ اعتدال پیدا ہو رہا ہے اور ترقی پسند ادب صحیح راستہ پر آ رہے ہیں، محض پرانے ادب سے بغاوت، کسی خاص ادب کی نقالی اور ہر نئے

خیال کو خواہ ہمارے قومی و ملی مزاج کے مخالف ہی ہو قبول کرنے کا نام ترقی پسندی نہیں ہے، بلکہ صحیح ترقی پسند ادب وہی ہے جس میں دونوں ادب کے اچھے عناصر اسطرح ہم آہنگ ہوں کہ قدیم ادب کی قابل قدر روایات کا دامن بھی ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے اور جدید تقاضوں کا بھی پورا لحاظ ہو، اسمیں قدیم ادب کا حسن اور پاکیزگی بھی ہو اور جدید ادب کی مقصدیت اور افادیت بھی، فکر و نظر اسی صحیح ترقی پسند ادب کا ترجمان اور مبلغ ہے اور اسکا پہلا نمبر اسی ادبی سنگم کا اچھا نمونہ ہے، اسمیں بڑے اعتدال و توازن کیساتھ اس ادب کی ترجمانی کی گئی ہے، قاضی عبد الغفار صاحب نے افتتاحیہ میں اس ادب کی ضرورت کیطرف توجہ دلائی ہے، اور رسالہ کے اغراض و مقاصد بیان کیے ہیں، پروفیسر رشید احمد صاحب نے جدید غزل کے حسن و رعنائی اور اسکی لطافتوں اور نزاکتوں کو اس خوبی سے دکھایا ہے کہ اسکو عروس تغزل کی مشاطگری کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ غزل کی تہذیبی اور کلچری حیثیت کی بحث میں جس لطیف حقیقت کیطرف اشارہ کیا ہے وہ اگرچہ نئی نہیں ہے لیکن اسکی جانب بہت کم نظر جاتی ہے، اور اسی نقطۂ نظر سے انھوں نے غزل کے جدید رجحانات کا جائزہ لیا ہے، یہ مضمون محض غزل کی وکالت نہیں ہے بلکہ اسکے بارہ میں صحیح نقطۂ نظر یہی ہے، غزل کی اصلی حقیقت پر اس سے بہتر مضمون ابتک نہیں لکھا گیا، اور وہ رشید صاحب کے شاہکار مضامین میں ہے، آل احمد صاحب سرور نے جدید اور قدیم ادب کی مشترک قدروں پر روشنی ڈالی ہے، اور قدیم ادب کی بھی اچھی قدروں کو دکھایا ہے، سرور صاحب اگرچہ ترقی پسند ادیب ہیں، لیکن وہ قدیم ادب کے ادا اور ادب شناس ہیں، اس لیے نئی شراب کے نشہ میں پرانے بادہ گلفام کی لذت نہیں بھولے ہیں، اور پرانے اور نئے ادب کے اچھے عناصر کو ہم آہنگ کرنے کی یہی صورت بھی ہے، خلیل الرحمن اعظمی نے جوش کے کلام کا تنقیدی جائزہ لیا ہے اور اس کا صحیح تجزیہ کر کے اس کا اصلی مقام واضح کیا ہے، ڈاکٹر عبد العلیم صاحب نے مارکسی نقطۂ نظر سے ادب پر روشنی ڈالی ہے جس سے بعض نام نہاد ترقی پسند ادیبوں کی بے راہ روی کی اصلاح ہو جاتی ہے، اسکے علاوہ ڈاکٹر مسعود حسین اور ڈاکٹر محمد حسن کے مضامین تخلیق شعر اور جدید اردو شاعری بھی مفید مضامین ہیں، آخرالذکر مضمون کا انداز تحریر اردو زبان کے لیے کچھ اجنبی سا ہے، ان مضامین کے علاوہ متعدد نظمیں اور غزلیں بھی ہیں، غرض مجموعی حیثیت سے یہ رسالہ ترقی پسند ادب کا ستھرا ترجمان ہے۔

"م"

جلد ۷۶ ماہ ربیع الاول ۱۳۷۵ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۵۵ء عدد ۵

مضامین